علامہ فضل حق اور انقلاب ۱۸۵۷ء

یس اختر مصباحی

دارالقلم ذاکر نگر نئی دہلی

قائدِ جنگِ آزادی

فضلِ حق خیر آبادی

یٰسٓ اختر مصباحی

بانی وصدر دار القلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

بانی رکن المجمع الاسلامی، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی

موبائل: 09350902937

طابع و ناشر

دار القلم-66/92 قادری مسجد روڈ، ذاکر نگر (جوگابائی ایکسٹینشن)

اوکھلا، نئی دہلی-110025 (انڈیا)

فون:011-26986872 فیکس نمبر:011-26987184

سلسلۂ مطبوعات (۱۸)

نام کتاب .... قائد جنگ آزادی علامہ فضل حق خیر آبادی

مؤلف .... یٰسٓ اختر مصباحی

زیر اہتمام .... دار القلم، ذاکر نگر، نئی دہلی

طبع اوّل ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء

صفحات .... دو سو آٹھ (208)

کمپوزنگ (۲۰۰۷ء) .... محمد توفیق مصباحی

قیمت .... ساٹھ روپے (-/60)

رابطہ کا پتہ

دار القلم - 66/92 قادری مسجد روڈ، ذاکر نگر (جوگا بائی ایکسٹینشن)

اوکھلا، نئی دہلی - 110025 (انڈیا)

فون: 011-26986872

فیکس نمبر: 011-26987184

فہرستِ کتاب

مضامین	صفحات

☆☆☆☆☆☆

انتساب بنام

علماو مشائخ ومشاہیرِ اسلام

(۱) مجدد الفِ ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی وصال — صفر ۱۰۳۴ھ/ دسمبر ۱۶۲۴ء

(۲) عاشقِ رسول شیخ عبدالحق محدث دہلوی // — ربیع الاول ۱۰۵۲ھ/ جون ۱۶۴۲ء

(۳) ابوالبرکات شیخ عبدالرشید جون پوری // — رمضان ۱۰۸۳ھ/ ۱۶۷۲ء

(۴) عارفِ حق سید شاہ عبدالرزاق قادری بانسوی (بارہ بنکی) // — ۱۱۳۶ھ/ ۱۷۲۴ء

(۵) صاحبُ البرکات سید شاہ برکت اللہ قادری مارہروی // — محرم ۱۱۴۲ھ/ اگست ۱۷۲۹ء

(۶) امام الھند شاہ ولی اللہ فاروقی محدث دہلوی // — ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء

(۷) حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں نقشبندی دہلوی // — ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء

(۸) حسان الھند سید محمد آزاد بلگرامی (ہردوئی) // — ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء

(۹) بیہقیِ وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی // — ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء

(۱۰) حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی // — ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء

(۱۱) حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی // — شوال ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء

(۱۲) بحرالعلوم علامہ عبدالعلی فرنگی محلی لکھنوی // — ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۱۹ء

(۱۳) شمس العارفین سید شاہ آل احمد اچھے میاں برکاتی مارہروی // — ۱۲۳۵ھ/ جنوری ۱۸۲۰ء

(۱۴) سراج الھند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی // — شوال ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء

(۱۵) حضرت شاہ غلام علی نقشبند ی دہلوی // — صفر ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۴ء

(۱۶) حضرت العلام علامہ فضل امام فاروقی خیرآبادی // — ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء

(۱۷) حضرت شاہ ابوسعید مجددی رام پوری // — ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء

(۱۸) حضرت شاہ محمد مخصوص اللہ محدث دہلوی // — ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء

(۱۹) حضرت شاہ احمد سعید مجددی دہلوی // — ربیع الاول ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء

(۲۰) حضرت مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی // — ربیع الاول ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء

(۲۱) خاتم الاکابر سید شاہ آل رسول احمدی مارہروی // — ذوالحجہ ۱۲۹۶ھ/ دسمبر ۱۸۷۹ء

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

عقیدت کیش

یٰسٓ اختر مصباحی

گردشِ ایام پہ غالب ہوا ہے فضلِ حق

ایک انقلاب دہر وہ تھا کہ دہلی اور بریلی و بدایوں و مراد آباد و لکھنؤ و شاہجہاں پور وغیرہ کے ہر محاذ پر ہندوستانیوں اور بالفاظِ دیگر مسلمانوں کی شکست و پسپائی کے بعد انگریز ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر علما و امرا کو قید و جلاوطنی و قتل و غارت گری کی انسانیت سوز اور وحشت ناک سزاؤں سے دوچار کیا کرتے تھے اور ان کی آتشِ انتقام اس وقت سرد ہوئی جب ان کے سامنے سرنگوں ہو کر اہل ہند نے ان کی محکومی و غلامی کو عملاً قبول کر لیا اور کسی کے اندر یہ جرأت و جسارت باقی نہ رہ گئی کہ ان کے اقتدار و حکومت کو چیلنج کرنے کا خیال بھی ظاہر کر سکے۔

دوسرا دور اس وقت شروع ہوا جب انگریز ہندوستان کی زیر زمین مزاحمت اور بین الاقوامی حالات (جنگ عظیم اول) کے پیشِ نظر ہندوستان سے اپنا رختِ سفر باندھ کر اپنے وطن برطانیہ کے لئے کوچ کی تیاری میں لگ گئے اور یہاں ہندوستانیوں کی اپنی حکومت قائم کرنے کی خواہش ان کے دل میں انگڑائیاں لینے لگیں۔

یہ دور اس بات کا متقاضی تھا کہ اپنے ان محسنوں اور جاں بازوں کو یاد کرے جنھوں نے بے پناہ مصائب و آلام جھیل کر انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے استخلاص وطن اور آزادیِ ہند کی راہ میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اور علما و قائدینِ انقلاب ۱۸۵۷ء کی خدمت اور قربانیوں کی صحیح اور جامع و مکمل تاریخ آج تک مرتب و مدون نہ کی جا سکی۔

حالات کی ستم ظریفی اور وقت کا المیہ ہے کہ ہندوستان سے پاکستان تک ایسے ہزاروں مخطوطات مؤرخین و محققین کی نگاہِ توجہ سے محروم ہو کر اس حد تک بوسیدگی و کہنگی کے شکار ہو چکے

ہیں کہ اب ان کے بیشتر اوراق کا مطالعہ اوران کا تحفظ بھی طرح طرح کی مشکلات کا باعث ہے۔

تیسرا زمانہ وہ آیا کہ ۱۹۲۰ء کے بعد کچھ سست رفتاری اور ۱۹۴۷ء کے بعد بڑی سرعت و تیز گامی کے ساتھ ایسی تاریخ لکھی اور پیش کی جانے لگی جس میں کچھ حقائق کے پہلو بہ پہلو اکاذیب واباطیل کی آمیزش نہایت چابک دستی سے کی جانے لگی اور جابہ جا فرضی تاریخ نویسی کا ناخوشگوار فریضہ انجام دیتے ہوئے ایسے ہوائی قلعے تعمیر کیے جانے لگے جن کی حیثیت ریت محل سے زیادہ نہیں اور تیشۂ تحقیق وتنقید کی ضرب سے وہ چند لمحات ہی میں بکھر کر اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں۔

صفحاتِ تاریخ میں جن علما و قائدین کو نمایاں جگہ ملنی چاہیے تھی اور جنھیں مسندِ اعزاز وافتخار پہ بٹھایا جانا چاہیے تھا ان کا ذکر سرسری اور ضمنی طور پر کیا گیا اور جن کا سرسری وضمنی ذکر ہونا چاہیے تھا کہ ان کا کوئی سرگرم کردار یا بالکل ہی کوئی کردار اور کوئی حصہ نہیں تھا انھیں جلی سرخیوں اور افسانوی کرداروں کے ساتھ پیش کیا گیا جسے ایک تاریخی المیہ کے سوااور کیا کہا جاسکتا ہے؟

حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ بعد کے بہت سے مسلم وغیر مسلم مؤرخین نے اسی مسخ شدہ تاریخ کو بلاتحقیق وتنقید کے آنکھ بند کر کے قبول کرلیا اور اسی بنیاد پر مبنی تاریخ کی عمارت کھڑی کرتے چلے گئے جس کا حال یہ ہے کہ اس کے مآخذ ومراجع کے مشتملات ہی جب مشکوک اور ساقط الاعتبار ہیں تو ان کا حشر ہر صاحب فکر وشعور پر خود ہی نمایاں ہے اور زبان حال سے وہ خود گویا ہے اور سننے سمجھنے والے اچھی طرح یہ حقیقت سمجھ رہے ہیں کہ — ’’کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان مَتی نے کنبہ جوڑا‘‘

تاریخ انقلاب ۱۸۵۷ء میں مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) و علامہ فضل حق خیرآبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) ومولانا احمد اللہ شاہ مدراسی (متوفی ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) ومولانا فیض احمد عثمانی بدایونی (متوفی نامعلوم) ومولانا سید کفایت علی کافی مرادآبادی (متوفی ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) ومفتی عنایت احمد کاکوروی (متوفی ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء) جیسے مشاہیر علما وقائدین کا جس عظمت واہمیت کے ساتھ ذکر ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوسکا اور انھیں جس طرح خراج عقیدت پیش کیا جانا چاہیے تھا وہ فریضہ ہمارے عہد کے علما و محققین ومؤرخین نہ ادا کرسکے۔

اس صورت حال میں جہاں ہماری اپنی غفلت وسستی کا دخل ہے وہیں ایک مخصوص زاویۂ نظر کے حامل گروہ کی بھی کرشمہ سازی ہے جس نے دانستہ طور پر صحیح تاریخ نویسی وتاریخ نگاری

سے اِعراض واغماض برتتے ہوئے اپنی کچھ پسندیدہ شخصیتوں کو نمایاں کرنے بلکہ تاریخ سازی و تاریخ گری کرنے اور قایدِ جنگِ آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی کی شخصیت کو مجروح کرنے میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ یہ کارنامہ ایسے ''مقدس ومحترم حضرات'' کا رہینِ منت ہے جن کا احتساب کیا جائے اور حقیقت بینی وحقیقت بیانی کا مظاہرہ کیا جائے تو نتیجہ کچھ اس قسم کا برآمد ہوگا کہ:

سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

یہی بات حکیم مسعود احمد برکاتی ٹونکی (ناظم آباد، کراچی) نبیرۂ حکیم سید برکات احمد ٹونکی نے اپنے الفاظ میں اس طرح کہی ہے:

علامہ فضل حق خیرآبادی ان مظلوم محسنینِ ملت میں سے ہیں جن کی بدولت آج ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ لیکن جن کی عظمت پہچاننے سے ہم محروم ہیں۔ بلکہ بعض ''تاریخ سازوں'' نے تو اس بانیِ جدوجہد آزادی کے روشن کردار کو مسخ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ان کی یہ احسان فراموشی تاریخ کے رخِ زیبا کی چمک کو کم نہ کر سکے گی۔ (ص ۱۷۹۔ امتیازِ حق۔ از راجہ غلام محمد (لاہور) طبع پنجم المجمع الاسلامی مبارک پور ضلع اعظم گڑھ۔ یوپی۔ ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء)

علامہ فضل حق خیرآبادی کے سیاسی وسماجی نظریات پر تحقیق کرنے والی روسی مصنفہ مادام ''پولونسکایا'' ممبر ادارۂ علوم شرقیہ، سائنس اکیڈمی، سوویت یونین کی تحقیقات کی نشان دہی کرتے ہوئے مشہور روسی مصنف ''شومسکی'' نے بھی کچھ اسی سے ملتے جلتے احساسات وخیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

> ''برطانوی علم تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی عوامی بغاوت کے بہت سے رہنماؤں اور شرکت کرنے والوں کے، خاص طور سے مولانا فضل حق خیرآبادی کے نظریات کو جس طرح مسخ کیا ہے پھر بعض جدید مطبوعات میں جو غلط تصور پیش کیا گیا ہے اس نے اور خود اس عوامی بغاوت کو ''غدر'' اور ''مٹھی بھر انگریز دشمن جاگیرداروں کی بغاوت'' کا نام دینے کی روش نے مادام ''پولونسکایا'' کو ان مسائل کے غائر مطالعہ پر اکسایا۔ (سوویت دیس،

دہلی۔۱۰ر جولائی ۱۹۵۸ء)

یہ علامہ فضل حق خیر آبادی وہ ہیں جن کے فضل و کمال کے روشن نقوش آپ زیرِ نظر کتاب کے صفحات پر جابجا دیکھیں گے اور آپ کی جامعیتِ علوم وفنون کا یہ عالم تھا کہ:

در علوم منطق و حکمت و فلسفہ و ادب و کلام و اصول و شعر فائق الاقران و استحضارے فوق البیان داشت۔ نظمش زاید بر چہار ہزار اشعار خواہد بود۔ الخ (ص ۱۶۴۔ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۱۴ء۔ وترجمہ اردو بر ص ۳۸۳۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۱ء)

"مولوی فضل حق بن مولوی فضل امام خیر آبادی عالم اجل اور فاضل بے بدل، حاوی اصول وفروع وجامع معقول ومنقول تھے ...... اساتذۂ وقت آپ کی شاگردی فخر جانتے تھے۔ ...... مولانا کو علم فلسفہ اور ادب میں یدِ طولیٰ تھا۔ (ص ۱۴۸۔ روضۃ الادبا از مولوی محمد الدین فوق)

...... مولانا فضل حق خیر آبادی تھے جن کے دم عیسوی نے معقولات میں روح پھونکی کہ ابن سینائے وقت مشہور ہوئے۔ دیار اطراف کے طلبہ نے ان کی طرف رجوع کیا اور منطق و فلسفہ کو نئے طور سے ملک میں رواج دیا۔ غدر کے ہنگامہ میں گرفتار ہو کر جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے اور وہیں ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی۔

...... مولانا فضل حق کے تلامذہ اور تلامذہ در تلامذہ نے سارے ملک میں پھیل کر علوم معقول کو بڑی رونق دی اور بڑے باکمال مدرس ثابت ہوئے۔ (ص ۲۳۔ حیات شبلی از سید سلیمان ندوی۔ مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڈھ، یوپی)

علامہ کی جرأتِ کردار کا عالم یہ تھا کہ مقدمہ لکھنؤ ۱۸۵۹ء میں جب کہ آپ خود اپنے مقدمہ کی وکالت کر رہے تھے اور رہائی کے پورے پورے آثار تھے۔ فصلِ حق شاہجہاں پوری کی کچھ باتیں آپ کے خلاف بطورِ الزام شامل کرنے کی وجہ سے فضل حق خیر آبادی کو اس فرد جرم سے علیحدہ کیے جانے کے امکانات روشن تھے۔ انگریز جج آپ سے اس بنیاد پر کچھ ہمدردی بھی رکھتا تھا کہ اس نے کسی زمانے میں آپ سے کچھ سیکھا تھا اس کے باوجود آپ نے کمال جرأت و ہمت کے ساتھ انگریزوں کے خلاف دیے گئے اپنے فتوائے جہاد کا بھری عدالت میں برملا اعتراف و اعلان کرتے ہوئے کہا کہ:

''ہاں وہ فتویٰ صحیح ہے۔ وہ میرا لکھا ہوا ہے اور آج بھی میں اپنے اس فتویٰ پر قایم ہوں۔''

اس سلسلے میں زیر نظر کتاب کے اندر کافی اطمینان بخش مواد آ گیا ہے۔ مزید برآں دو نئے حوالے سرِ دست ملاحظہ فرماتے چلیں:

''ان تمام مناصبِ جلیلہ کے بعد مولانا کی دینی آزمائش کا وقت آیا اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مولانا بھی باغی قرار دیے گئے۔ ۱۸۵۹ء میں سلطنتِ مغلیہ کی وفاداری یا فتوائے جہاد کی پاداش یا جرمِ بغاوت میں مولانا ماخوذ ہو کر سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا تو رہائی کے بہت سے اسباب اگرچہ پیدا ہو گئے تھے لیکن مولانا نے خود فتویٰ کی تصدیق نہایت جرأتِ ایمانی سے کر دی اس لئے عبور دریائے شور کی سزا ہوئی اور وہ جزیرۂ انڈمان روانہ کر دیے گئے۔ (ص۳۳۲۔ حکمائے اسلام جلد دوم۔ مؤلفہ مولانا عبدالسلام ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ۔ یوپی)

''انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ آپ کے ایما پر تیار ہوا اور اس پر آپ کے دستخط تھے۔ کردار اتنا بلند تھا کہ اس ''جرم'' کی پاداش میں جب مقدمہ چلا تو گواہ اسے ثابت نہ کر سکے۔ مگر مولانا نے خود اس کا اعتراف کر لیا اور اسی حق گوئی کی بنا پر جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے اور وہیں وفات پائی۔ (روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ شمارہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۹ء۔ بقلم میاں عبدالرشید کالم نگار بعنوان ''نور بصیرت'' نوائے وقت)

انقلاب ۱۸۵۷ء کے دوران بہادر شاہ ظفر نے جو سہ نفری کنگ کونسل بنائی تھی اس میں علامہ فضل حق خیرآبادی و جنرل بخت خاں روہیلہ اور مولوی سرفراز علی شامل تھے۔ اس کنگ کونسل کو پریوی کونسل بھی کہا گیا ہے۔ یہ بیان سید مبارک شاہ رام پوری کوتوال شہر دہلی در ۱۸۵۷ء کا ہے۔ (ص ۱۲۸ و ۱۳۱۔ دی گریٹ ریولیشن آف ۱۸۵۷ء از ڈاکٹر سید معین الحق، کراچی)

علامہ فضل حق خیرآبادی اور بہادر شاہ ظفر کے باہمی روابط و مشاورت کا ذکر کرتے ہوئے حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) نبیرۂ حکیم سید برکات احمد ٹونکی لکھتے ہیں:

......مولانا فضل حق خیرآبادی نے جب ۱۸۳۱ء میں دہلی کی سررشتہ داری سے مستعفی ہو کر

دہلی کا قیام ترک کیا۔ اور ریاست جھجھر تشریف لے جانے لگے تو:

ولی عہد سلطنت صاحب عالم مرزا ابوظفر بہادر شاہ نے اپنا دوشالہ علامہ کو اڑھایا اور بوقت رخصت آبدیدہ ہو کر کہا۔

چوں کہ آپ جانے کے لئے تیار ہیں میرے لئے بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کرلوں مگر خدا علیم ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے۔ (ص ۱۴۸۔ کلیات نثرِ غالبؔ)

مولانا فضل حق بہادر شاہ سے برابر ملاقاتیں کرتے رہے اور ان کی توجہ وقت کے اہم مسائل کی طرف دلاتے رہے اور ان کے حل کے سلسلے میں اپنے مخلصانہ مشورے بھی دیتے رہے۔ اور بہادر شاہ اس اعتماد کی بنا پر جو اسے مولانا کے اخلاص اور ان کی اِصابتِ رائے پر تھا ان مشوروں پر عمل کیا کرتے تھے۔ مثلاً

ایک ملاقات جو غالباً ۱۲ رمئی ۱۸۵۷ء کو ہوئی اس کی تفصیل حکیم احسن اللہ خاں نے اپنی یادداشتوں میں دی ہے۔ (ص ۲۳ و ۲۴۔ میموریز آف حکیم احسن اللہ خاں۔ مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق کراچی ۱۹۵۸ء) اس ملاقات میں جن مسائل پر گفتگو ہوئی وہ یہ ہیں:

(۱) مجاہدین کی اِعانت۔ روپیہ اور سامانِ رسد سے۔

(۲) اہل کار حکام کا تقرر

(۳) مال گذاری کی تحصیل کا انتظام

(۴) ہمسایہ والیانِ ریاست کو جنگ میں اعانت و شرکت کی دعوت۔

چوں کہ مجاہدین کی مالی اعانت، مال گذاری کی تحصیل اور والیانِ ریاست کی مالی اعانت پر موقوف تھی اس لئے حکیم صاحب کے بیان کے مطابق:

بادشاہ نے حکم دیا کہ مولوی صاحب کی تجویز کے مطابق والیانِ ریاست کو پروانے لکھے جائیں اور بعجلت روانہ کردیے جائیں۔

قابل اعتماد اور کارداں حکام کے تقرر کے سلسلے میں مولانا نے اپنے اعزہ کی خدمات پیش کی تھیں۔ چنانچہ دو اہم مناصب پر مولانا کے دو اَعِزّہ مقرر کیے گئے۔

(۱) مولانا عبدالحق خیر آبادی:— آپ مولانا فضل حق کے فرزند گرامی تھے اور غدر سے پہلے الور میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ مولانا عبدالحق گوڑگانوہ (میوات) کے کلکٹر مقرر کیے

گئے۔ (ص ۲۲۲۔ غدر کی صبح و شام از منشی جیون لال۔ ص ۱۳۱۔ غدر کے گرفتار شدہ خطوط۔ ص ۶۸۷ا و ۶۹۱۔ تاریخ عروجِ سلطنت انگلشیہ از منشی ذکاء اللہ دہلوی)

(۲) میر نواب (مولانا فضل حق کے داماد سید احمد حسین رسوا (مضطر خیر آبادی و بسمل خیر آبادی کے والد) فرزند سید تفضّل حسین کے حقیقی بھائی) کو اسی روز (۱۲رمئی) دہلی کا گورنر مقرر کیا گیا (ص ۱۰۲۔ روزنامچہ منشی جیون لال)

مولانا فضل حق کو بہادر شاہ کی طرف سے جو اختیارات حاصل تھے اور انتظامی امور میں جو دخل تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بہت سے حکام کا تقرر مولانا نے براہ راست بھی کیا تھا۔ حکیم احسن اللہ کا بیان ہے کہ:

مولوی فضل حق نے بھی کئی تحصیل داروں کو ضلع دار کی نیابت میں مقرر کیا۔ (ص ۲۵۶۔ بہادر شاہ کا مقدمہ۔ بیان حکیم احسن اللہ خاں)

اس طرح لال قلعہ کے دار الانشا (سکریٹریٹ) سے مولانا کے حکم سے پروانے جاری ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ بہادر شاہ کا پرائیویٹ سکریٹری مکند لال اپنی ایک تحریر (مؤرخہ ۱۸راگست ۱۸۵۷ء میں لکھتا ہے کہ:

بہادر شاہ کے دربارِ عام سے اپنے کمرۂ خاص میں چلے جانے کے بعد مولانا نے حسب ذیل افراد کے نام پروانے جاری کرنے کا حکم دیا:

(۱) بنام حسن بخش عرض بیگی۔ ضلع علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے کے لئے۔

(۲) بنام فیض محمد (غالباً مولانا فیض احمد بدایونی)۔ ضلع بلند شہر اور علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔

(۳) بنام ولی داد خاں۔ مذکورہ دونوں آدمیوں کو، آمدنی وصول کرنے میں مدد دینے کے لئے۔

(۴) بنام مولوی عبد الحق۔ ضلع گوڑگانوہ کی مال گذاری وصول کرنے کا انتظام کیا جائے۔

(ص ۲۹ و مابعد۔ غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط۔ (ص ۳۸ تا ۴۱۔ فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء۔ مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۵ء)

حکیم احسن اللہ خاں (بہادر شاہ ظفر کا مشیرِ خاص) اپنی یادداشت میں لکھتا ہے:

''مولوی (فضل حق) صاحب جب بھی بادشاہ کے پاس آتے بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جہاد کی مہم میں اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں اور ان کے ساتھ باہر بھی نکلیں۔ فوجی دستوں کو حتی الامکان بہتر معاوضہ دیں۔ ورنہ انگریز جیت گئے تو نہ صرف خاندانِ تیمور بلکہ تمام مسلمان نیست و نابود ہو جائیں گے۔''

(Memories of Hakeem Ahsanullah Khan, Edited by S. Moinul Haq. Pakistan Historical Society, Karachi 1958. P.24)

جولائی ۱۸۵۷ء میں علامہ فضل حق خیر آبادی نے شاہجہانی جامع مسجد دہلی میں انگریزوں کے خلاف جو ولولہ انگیز تقریر کی اور جہاد کا فتویٰ مرتب کر کے تصدیقاتِ علما کے بعد اسے مشتہر کرایا اور انقلابیوں میں ایک نیا حوصلہ اور امنگ پیدا کر کے انگریزوں سے بھرپور ٹکر لینے کی جو تاریخ ساز خدمت انجام دی اس کا ذکر اس دور کے ایک مؤرخ منشی ذکاء اللہ دہلوی اور بعد کے بے شمار محققین و مؤرخین نے کیا ہے جسے آپ زیر نظر کتاب کے آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

ایک گراں قدر کام علامہ فضل حق خیر آبادی نے یہ کیا کہ شاہی کابینہ اور مجلس انتظامی کا دستور العمل بھی ۱۸۵۷ء ہی میں مرتب فرمایا جو اس بات کا واضح اعلامیہ تھا کہ انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے ملک کو نجات دلا کر مغل فرماں روا اسی دستور العمل کے مطابق نظام حکومت چلائیں گے۔ یہ دستور العمل بھی اسی کتاب کے آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۸۰۳ء سے دہلی میں یہ ڈنکا پیٹا جاتا تھا کہ:

''خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا''

یہ نعرہ بدل کر ۱۲؍مئی ۱۸۵۷ء سے اس طرح ڈنکا پیٹا جانے لگا کہ

''خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم بادشاہ کا''

علامہ فضل حق خیر آبادی نے مغل سلطنت کے استحکام و مرکزیت کے لئے جو دستور العمل ترتیب دیا تھا اس کا ذکر منشی ذکاء اللہ دہلوی نے اپنی کتاب ''تاریخ عروج سلطنتِ انگلیشیہ'' (ص ۶۸۷) میں اس طرح کیا ہے:

''مولوی صاحب عالم متبحر مشہور تھے۔ وہ الور سے ترکِ ملازمت کر کے دہلی آئے تھے۔ انھوں نے بادشاہ کے لئے ایک دستور العمل سلطنت لکھا تھا۔''

حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) اس دستور العمل کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''اس دستور کی بنیاد پر جو ظاہر ہے کہ اصولی اور اسلامی احکام پر مشتمل ہوگا، ایک مجلس منتظمہ (جلسۂ انتظام) تشکیل دی گئی اور بقول مہدی حسین (ص۱۸۲۔ بہادر شاہ دوم) اس کا ڈائرکٹر (نگراں) مولانا کو بنایا گیا۔ اس مجلس انتظامیہ کے قواعد وضوابط (بائی لاز) کا مسودہ اتفاق سے محفوظ رہ گیا ہے۔ بھارت کے نیشنل آرکائیوز میں وہ مسودہ محفوظ ہے۔ (For Pol. Cons. N.A. Box 57-No.539-541) اور اس کا عکس ہمارے پیش نظر ہے۔

یہ تحریر اردو میں ہے اور اس نقطۂ نظر سے بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہے کہ اس نوع کے اجتماعی اور دستوری مسائل پر یہ غالباً پہلی اردو تحریر ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے سیاسی مسائل اور انجمنوں واداروں کے سلسلے میں اردو اصطلاحات میں عہد بہ عہد تغیرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ (ص۵۳، ۵۴۔ فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء۔ از محمود احمد برکاتی)

آج کل کی اصطلاح میں اسے آپ کابینہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ملک کا جو دستور مرتب کیا گیا تھا اس دستور کی روشنی میں جو کابینہ تشکیل پانا تھی، یہ اس کابینہ کے بائی لاز ہیں کہ یہ کابینہ کس طرح فیصلے کرے؟ اس کی ہیئت کیا ہو؟ وغیرہ۔ چنانچہ قواعد وضوابط کے پہلے ہی جملے میں ہے:

''ازاں جا کہ واسطے رفع برہمی سررشتہ اور موقوفی بدانتظامی طریقہ فوجی و ملکی کے مقرر ہونا دستور العمل کا واجب اور مناسب اور واسطے عمل درآمد دستور کے اولاً متعین ہونا کورٹ کا ضروری ہے اس لئے حسبِ ذیل قواعد لکھے جاتے ہیں۔''

یعنی قیامِ نظم وامن کے لئے دستور کا ہونا ضروری ہے اور دستور پر عمل درآمد کورٹ ہی کر سکتا ہے۔ اس لئے کورٹ کے قواعد منضبط کیے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ دستور نہیں بلکہ دستور کو نافذ وروبعمل کرنے والے کورٹ کے قواعد ہیں۔

یہ کورٹ دس ارکان پر مشتمل تھا جن میں ۶ فوج کے نمائندے تھے اور ۴ شہری۔ فوج کے نمائندے تین قسم کی فوجوں، پیادہ (انفنٹری) سوار (کیویلری) اور توپ خانہ (آرٹلری) میں سے دو دو منتخب ہوتے تھے۔ ۴ شہری ارکان کے لئے قواعد میں کوئی وضاحت نہیں ہے کہ ان کا معیار انتخاب کیا ہوگا؟ نہ مولانا کے سوا کسی اور شہری رکن کا نام کہیں نظر سے گذرا۔

انگریزوں کے مخبر تراب علی نے یکم ستمبر ۱۸۵۷ء کو ''دہلی کی خفیہ خبروں'' کے عنوان سے جو مراسلہ انگریز حکام کو بھیجا تھا اس میں اس کورٹ کی تشکیل کی خبر کے ساتھ کورٹ کے فوجی ارکان کی فہرست دی ہے اور آخر میں لکھا ہے:

''مولوی فضل حق بھی اس کے ایک رکن ہیں۔'' (میوٹنی ریکارڈ۔ جلد ۱۱۔ حصہ ۱۱۔ $\frac{8}{9}$ وسکریٹریٹ لیٹرس نمبر ۱۱۹۔ مورخہ ۷/ستمبر ۱۸۵۷ء)

ممکن ہے باقی ۳ شہری ارکان کی شمولیت مختلف مصالح اور مجبوریوں کے پیشِ نظر معرضِ التوا میں پڑ گئی ہو اور غیر فوجی رکن صرف مولانا فضل حق ہی رہے ہوں جو اس دستور کے مصنف اور مرتب تھے جس کی بنیاد پر یہ کورٹ تشکیل دیا گیا تھا۔

اس کورٹ کے ارکان کو جو حلف اٹھانا پڑتا تھا اس سے اس کے دائرۂ کار، اختیارات کی وسعت اور حدودِ اختیارات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ حلف یہ تھا:

''کام کو بڑی دیانت اور امانت سے بلا رو رعایت کمالِ جاں فشانی سے اور غور و فکر سے سرانجام کریں گے اور کوئی دقیقہ دقائق متعلقۂ انتظام سے فرو گذاشت نہ کریں گے اور حیلۃً وصراحۃً اخذِ اجر یا رعایت کسی طرح کسی لحاظ سے وقت تجویز امور انتظام کورٹ میں نہ کریں گے، بلکہ ہمیشہ ساعی اور سرگرم ایسے انتظام امورات سلطنت میں مصروف رہیں گے کہ جس سے استحکام ریاست اور رفاہ اور آسائشِ رعیت ہو اور کسی امر مجوزۂ کورٹ کو بے اجازت کورٹ اور صاحب عالم (مرزا مغل) قبل اجرا اس کے صراحتاً یا کنایۃً کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔''

اس حلف سے اندازہ ہوتا ہے کہ

(۱) کورٹ کی مدت کار صرف ہنگامی حالات اور زمانۂ جنگ تک محدود نہیں ہے بلکہ زمانۂ مابعد جنگ (اغیار سے استخلاصِ وطن) کے مسائل بھی پیشِ نظر ہیں۔

(۲) صرف دہلی اور جنگ سے متاثرہ علاقے تک اس کورٹ کا دائرۂ کار محدود نہیں ہے بلکہ سلطنت، ریاست (اسٹیٹ) جیسے الفاظ بتاتے ہیں کہ پورے ملک کا انتظام مقصود ہے۔

ان قواعد میں سب سے اہم بات وہ ہے جس کی طرف ہم پہلے توجہ دلا چکے ہیں کہ اس کے ذریعے بادشاہ کو بے اختیار اور صرف آئینی سربراہ بنا دیا گیا ہے۔ دفعہ ٦ میں ہے:

''جو امورات انتظام کے پیش آئیں اول تجویز ان کی کورٹ میں ہوگی اور بعد منظوری صاحب عالم بہادر کے اطلاع رائے کورٹ سے حضور والا میں ہوتی رہے گی۔''

اس طرح اصل فیصلہ کورٹ کرے گا جس کو صاحبِ عالم (مرزا مغل جو کمانڈر انچیف تھے) منظور کر کے بادشاہ کو صرف اس کی اطلاع کر دیں گے۔

دفعہ نمبر ۷ میں ہے کہ کورٹ کے ہر فیصلے کے نفاذ کے لئے صاحب عالم کی منظوری اور حضور والا (بادشاہ) کی اطلاع ضروری ہے مگر جب کسی فیصلے سے صاحب عالم کو اتفاق نہ ہو تو وہ کورٹ کو واپس کر دیں گے اور کورٹ اس پر نظر ثانی کر کے پھر صاحب عالم کو بھیج دے مگر صاحب عالم کا کام صرف یہ ہوگا کہ وہ اس فیصلے کو حضور والا تک پہنچا دیں اور اس صورت میں حضور والا کا فیصلہ ناطق ہوگا۔

بہادر شاہ کو اپنے اختیارات پر یہ قدغن پسند نہیں تھی اور ہونی بھی نہیں چاہیے تھی۔ اگر انھیں مستقبل کے ہولناک واقعات کا وہ اندازہ ہوتا جو مولانا فضل حق کو تھا تو یہ جدو جہد ناکام ہی کیوں ہوتی؟ چنانچہ انھوں نے گرفتار ہونے کے بعد فوجی عدالت کے سامنے جو بیان دیا تھا اس میں اس کورٹ کا بھی ذکر کیا تھا۔

''باغی سپاہ نے ایک کورٹ قائم کیا تھا جہاں تمام معاملات کے فیصلے ہوتے تھے اور جن معاملات کو وہاں طے کیا جاتا تھا انھیں کو یہ کونسل اختیار کرتی تھی، لیکن میں نے ان کی کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔ (ص ۱۳٦۔ بہادر شاہ کا مقدمہ)

ایک بار لال قلعہ کے ایک حصے میں مجاہدین کا قیام بہادر شاہ کو گوارا اور مناسب معلوم نہ ہوا تو

مرزا مغل کو لکھا کہ: کورٹ کے ممبران سے انھیں ہٹانے کے لئے کہو۔ (گرفتار شدہ خطوط)

شاہ زادگان عالی تبار کو بھی یہ دخل در معقولات بہت ناگوار تھا۔ چنانچہ ان کے بھی کئی شکایت نامے اوراقِ تاریخ نے ''وقت ضرورت'' کام میں لانے کے لئے سینے سے لگا رکھے ہیں۔ (ص ۸۱ و ۸۲۔ گرفتار شدہ خطوط) (ص ۵۵ تا ۵۹۔ فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء۔ حکیم محمود احمد برکاتی)

مذکورہ دستورِ العمل کی نقل سریندر ناتھ سین کی کتاب (Eighteen Fifty Seven) اور ڈاکٹر مہدی حسین کی کتاب (Bahadurshah and the War of 1857 in Delhi) میں بھی موجود ہے۔

ملک وملت وامور سلطنت ورفاہِ خلق سے علامہ فضل حق خیر آبادی کی دل چسپی کوئی نئی نہیں تھی بلکہ آغازِ امر ہی سے تھی۔ چنانچہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے تقریباً تیس (30) سال پہلے اکبر شاہ ثانی (متوفی ۱۸۳۷ء) کے نام رعایائے شہر دہلی کے نمائندہ وترجمان کی حیثیت سے جو درخواست علامہ فضل حق نے تقریباً ۱۸۲۶ء میں پیش کی تھی اس سے آپ کی دور اندیشی اور سیاسی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ درخواست بزبان ''فارسی'' ہے جو نوائے ادب بمبئی جلد ۱۳۔ شمارہ ۳ ر جولائی ۱۹۶۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔ حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی نے اپنی مذکورہ کتاب کے ضمیمہ (ص ۹۱ تا ۹۴) میں اس کو شائع کر دیا ہے۔ جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

''یہاں کے باشندے ہندو ہوں یا مسلمان، ملازمت، تجارت، زراعت، حرفت، زمینداری اور دریوزہ گری پر معاش رکھتے ہیں۔ انگریزوں کی حکومت کے قیام سے معاش کے یہ تمام وسائل مسدود ومفقود ہو گئے ہیں۔ ملازمت کے دروازے شہریوں پر بند ہیں۔ تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ کپڑا، سوت، ظروف اور گھوڑے وغیرہ تک وہ فرنگ سے لے کر خود فروخت کر کے نفع کماتے ہیں۔ معافی داروں کی معافیاں ضبط کر لی گئی ہیں۔ کسانوں کو محاصل کی کثرت نے بدحال کر دیا ہے۔

ان چاروں طبقوں کی زبوں حالت کے نتیجے میں اہل حرفہ اور ان کے سب کے نتیجے میں دریوزہ گر تنگیِ معاش کے شکار ہیں۔

دہلی میں، ہوڈل وغیرہ بہت سے پرگنے جاگیر میں شامل تھے اور جاگیرداروں کے یہاں ہزاروں آدمی فوج، انتظامی امور اور شاگرد پیشہ کی خدمت پر مامور تھے۔ اب یہ پرگنے اور دیہات و

مواضعات انگریزوں نے ضبط کر لیے ہیں اور لاکھوں کسان بے روزگار ہو گئے ہیں۔

بیواؤں کی معاش چرخہ کاتنے، رسیاں بٹنے اور چکی پیسنے پر موقوف تھی۔ اب رسّی کی تجارت حکومت (کمپنی) نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور ہاتھ کی چکیوں کی جگہ پن چکیاں لگ گئی ہیں تو یہ ذریعۂ معاش بھی جاتا رہا۔

عوام کی اس بے بضاعتی اور بے روزگاری کی وجہ سے اہل حرفہ اور ساہوکار بے روزگار اور رزق سے محروم ہو گئے ہیں۔

ان سب پر مستزاد چارلس مٹکاف نے یہ حکم دیا ہے کہ غریب زرِ چوکیداری ادا کریں۔ (ولایات متحدہ اودھ و آگرہ میں ۱۸۱۴ء میں چوکیدارہ ٹیکس کا قانون نافذ ہوا۔ اسی دوران یا چند سال بعد دہلی میں بھی یہ قانون نافذ کیا گیا۔ حاشیۂ کتاب)

دوسرا حکم یہ ہوا کہ ہر گلی کے دروازے پر پھاٹک لگایا جائے جس کا کوئی فائدہ معلوم و متصور نہیں ہے۔

تیسرا حکم یہ ہوا ہے کہ ان پھاٹکوں کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات مقرر ہوں جس سے بھی مشکلات کا سامنا ہے۔

چوتھا حکم یہ ہوا ہے کہ ہر محلے میں پانچ پانچ پنچ مقرر کیے جائیں۔"

اس درخواست سے جہاں مولانا فضل حق خیر آبادی کی سیاسی بصیرت اور عوام کے مسائل اور شہری زندگی کی مشکلات پر ان کی گہری نگاہ کا ثبوت ملتا ہے وہاں یہ بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ انھوں نے ان تمام مشکلات و مصائب کے سرچشمہ پر انگلی رکھ کر صحیح تشخیص کر لی تھی۔ اور اسباب کا تجسس کر کے اس کا تعین فرما دیا تھا کہ یہ سارے مسائل غیر ملکی حکمرانوں کے پیدا کردہ ہیں۔

پھر یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ درخواست دہلی کے ریزیڈنٹ کے نام نہیں ہے جو شہر و ضلع کا حقیقی (عملاً) حاکم تھا۔ بلکہ "حضور جہاں پناہ" کے نام ہے۔ یعنی ساکنانِ دہلی کے مسائل لال قلعہ کے بے اختیار و محروم اقتدار مغل "شہنشاہ" (اکبر شاہ ثانی) کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ حالاں کہ لال قلعہ ۱۸۰۳ء سے ویران تھا اور اکبر شاہ ثانی کے والد شاہِ عالم کی حکومت دہلی سے پالم تک رہ گئی تھی۔ اکبر شاہ ثانی کی تو صرف لال قلعہ تک محدود تھی۔ خود "شہنشاہ" نے کمپنی کی وظیفہ خواری پر قناعت کر لی تھی اور عوام بھی اپنی تمام ضروریات کے سلسلے میں نئے حکمرانوں کی طرف متوجہ

ہوتے تھے۔ (ص ۲۴ تا ۲۶۔ فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء۔ از محمود احمد برکاتی ٹونکی۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۵ء)

باشندگانِ شہر دہلی کے نمائندہ کی حیثیت سے علامہ فضل حق خیر آبادی کی طرف سے اکبر شاہ ثانی کی خدمت میں پیش کردہ درخواست پر ایک جامع اور فکر انگیز تبصرہ کرتے ہوئے حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی مزید تحریر فرماتے ہیں:

''ان حالات میں برصغیر کا ایک عالم دین۔ جس کے لے کہا جاتا ہے کہ وہ سیاست نہیں جانتا— عوام کو دوبارہ لال قلعہ کے پھاٹک کی طرف لیے جارہا ہے اور ان کی طرف سے درخواست لکھ کر اور ان کے حالات وخیالات کا ترجمان بن کر ان کو ''حضور جہاں پناہ'' کے دیوانِ عام میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔

اور اس طرح ایک پیچیدہ نفسیاتی تحریک چلاتا ہے جس سے ایک طرف عوام کو دوبارہ اپنے جانے پہچانے مرکزِ حکومت سے گرہ کشائی اور حلِ مشکلات کی توقعات پیدا ہوں گی۔

دوسری طرف خود ان ''جہاں پناہ'' کی خودی کے بیدار ہونے کے امکانات ابھریں گے اور ان کی غیرت وحمیت بھی ممکن ہے انگڑائی لے کر جاگ اٹھے۔

تیسری طرف برطانوی حکومت کے کارکن چونکیں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ سمتِ قبلہ پھر تبدیل ہو رہی ہے۔

اور وہ چونک کر ایک طرف تو ان مشکلات پر توجہ دیں گے۔ دوسری طرف شاہ کے ساتھ اپنے رویہ میں نرمی اختیار کریں گے اور ان گستاخیوں اور اہانت کوشیوں کو لگام دیں گے جن کا سلسلہ انھوں نے کئی سال سے شروع کر رکھا تھا۔ (ص ۲۷۔ فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء۔ از حکیم محمود احمد برکاتی)

یہ ہے اصل تاریخ انقلاب کا وہ تسلسل جسے علامہ فضل حق خیر آبادی کی دور بین نگاہوں نے اپنی خداداد ذکاوت وفطانت واستقامت وبصیرت سے دار السلطنت دہلی کی سرزمین پر رقم کی ہے مگر اس تاریخ کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈیڑھ صدی سے مٹانے، چھپانے، بھلانے بلکہ اپنے خون جگر سے اس تاریخ کو رقم کرنے والے فرزندِ عظیم وبطلِ جلیل کی شخصیت وحیثیت کو مجروح و داغ دار کرنے کی بھی مذموم کوشش کی جارہی ہے۔ اس غفلت شعاری واحسان ناشناسی ومحسن کشی پر رئیس احمد جعفری ونادم سیتاپوری جیسے حضرات بھی اپنا درد وکرب نہ چھپا سکے اور یں لکھنا پڑا کہ:

''مولانا فضل حق خیرآبادی ایک یگانۂ روزگار عالم تھے۔ عربی زبان کے مانے ہوئے ادیب اور شاعر تھے۔ علوم عقلی کے امام اور مجتہد تھے۔ اور ان سب سے بالا ان کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ بہت بڑے سیاست داں، مفکر اور مدبر بھی تھے۔ مسندِ درس پہ بیٹھ کر وہ علوم وفنون کی تعلیم دیتے تھے اور ایوانِ حکومت میں پہنچ کر وہ دور رس فیصلے کرتے تھے۔ وہ بہادر اور شجاع بھی تھے۔

''غدر'' کے بعد نہ جانے کتنے سورما اور رزم آرا ایسے تھے جو گوشۂ عافیت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے، لیکن مولانا فضل حق ان لوگوں میں تھے جو اپنے کیے پر نادم و پشیماں نہیں تھے۔ انھوں نے سوچ سمجھ کر میدان میں قدم رکھا تھا اور اپنے اقدام وعمل کے نتائج بھگتنے کے لئے وہ حوصلہ مندی اور دلیری کے ساتھ تیار تھے۔ سراسیمگی، دہشت، اور خوف یہ ایسی چیزیں تھیں جن سے مولانا بالکل ناواقف تھے۔

مولانا کی شخصیت، سیرت، کردار اور علم وفضل پر ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب لکھی جاتی۔ لیکن وہ ایک زود فراموش قوم کے فرد تھے۔ فراموش کر دیے گئے، اور کچھ دنوں کے بعد لوگ حیرت سے دریافت کریں گے کہ۔ یہ کون بزرگ تھے؟ (ص ۸۵۴۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد۔ مؤلفہ رئیس احمد جعفری، طبع اول۔ کتاب منزل لاہور)

''انگریز اور ان کے ہوا خواہ تو مولانا (فضل حق خیرآبادی) سے اس لئے ناراض تھے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں کسی نہ کسی نہج (بلکہ قائدانہ حیثیت سے۔ اختر مصباحی) سے ان کا نام آگیا۔ لیکن خود مسلمانوں کا ایک ''پروپگنڈسٹ گروپ'' مولانا سے اس لئے بے زار تھا کہ وہ ان کے مذہبی نظریات کے خلاف عالمانہ مجاہدہ کر چکے تھے۔

یہ باوقار علمی مباحثے کوئی ذاتی اور عامیانہ جنگ نہیں تھی جس کا سہارا لے کر مولانا خیرآبادی کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کر دیا جاتا۔ لیکن ہوا کچھ ایسا ہی''۔ (ص ۱۰۱۔ غالب نام آورم از نادم سیتاپوری مطبوعہ لاہور)

علامہ فضل حق خیرآبادی کی بصیرت ومآل اندیشی، ہمت وشجاعت اور ان کے استقلال و استقامت پر قربان جایئے کہ ایک طرف لگ بھگ ۱۸۲۶ء میں وہ برطانوی اقتدار کو نظر انداز کرتے ہوئے باشندگانِ دہلی کی قیادت ونمائندگی کرتے ہوئے اپنے قدیم مرکز لال قلعہ سے ان کی وابستگی مضبوط کرنے کے لئے اکبر شاہ ثانی کے دروازے پر ایک جم غفیر کے ساتھ دستک دیتے ہیں اور

دوسری جانب عین حالتِ اسیری میں جزیرۂ انڈمان سے اپنے ملک کے باشندوں کی اور خود اپنی داستانِ کرب و بلا (بشکل الثورۃ الھندیۃ وقصائد فتنۃ الھند) لکھ کر ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء میں مفتی عنایت احمد کاکوروی (متوفی ۱۲۷۹ء/۱۸۶۳ء) کے بدست انڈمان سے ہندوستان لکھ بھیجتے ہیں اور اس خطرناک وزہرہ گداز اقدام پر ان کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی کہ انگریز ظالموں کو اگر اس کی خبر لگ گئی تو پھر اس کا انجام کتنا بھیانک ہوگا؟ ایسے ہی اصحاب عزیمت واستقامت کی بارگاہ میں یہ شعر نذر کیے جانے کے لائق ہے اور صحیح معنوں میں یہی علمائے حق اس کے مستحق بھی ہیں کہ ان کے بارے میں کہا جائے۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یٰسٓ اختر مصباحی
بانی وصدر دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵
موبائل: 09350902937
فون: 011-26986872
فیکس: 011-26987164

جمعۃ المبارکہ
۴؍رجب ۱۴۲۸ھ
۲۰؍جولائی ۲۰۰۷ء

☆☆☆☆☆

علامہ فضل حق خیرآبادی

دینی و علمی احوال و آثار

علامہ فضل حق خیرآبادی ابن علامہ فضل امام خیرآبادی ابن علامہ قاضی ارشد ہرگامی کی ولادت خیرآباد ضلع سیتاپور اَودھ میں ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں ہوئی۔

علامہ فضل امام خیرآبادی صدر الصدور دہلی (متوفی ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء) اپنے وقت کے عظیم المرتبت و جلیل القدر عالم دین اور امامِ معقولات تھے۔ علم منطق کی مشہور زمانہ درسی کتاب ''مرقات'' علامہ فضل امام ہی کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ حاشیۂ میر زاہد اور حاشیۂ میر زاہد ملا جلال، حاشیۂ افق المبین، تشحیذ الاذھان شرح میزان المنطق، خلاصۃ التاریخ، آمد نامہ، نخبۃ السر آپ کی علمی و تحقیقی یادگاریں ہیں۔ تلخیص الشفاء کا ایک مبیضہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری میں موجود ہے۔

آپ کے بارے میں سلسلۂ خیرآباد کے فاضل اور شعبۂ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ریٹائرڈ اسسٹنٹ لائبریرین مولانا عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی (متولد جنوری ۱۹۱۵ء۔ متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) لکھتے ہیں:

''علمی قابلیت کا اندازہ تو اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک جانب شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کا ڈنکا منقولات میں بج رہا تھا اور دوسری طرف اسی دہلی میں مولانا فضل امام کے معقولات کا سکہ چل رہا تھا۔ طلبا دونوں دریاؤں سے سیراب ہو رہے تھے۔ مفتی صدر الدین

آزردہ، علامہ فضل حق وغیرہما بھی دوسرے طلبا کی طرح حدیث ایک جگہ پڑھتے تھے اور منطق و فلسفہ دوسری جگہ۔ خود علامہ کی ذات گرامی مولانا کی مسلم الثبوت قابلیت کی شاہد عدل ہے۔“
(ص ۱۳۸۔ باغی ہندوستان طبع چہارم۔ المجمع الاسلامی، مبارکپور ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء)

علامہ فضل امام خیر آبادی، علامہ عبدالواجد حنفی کرمانی خیر آبادی (صدرالصدور دہلی) شاگرد حضرت مولانا حاجی صفت اللہ محدث خیر آبادی و مولانا محمد اعلم سندیلوی کے شاگرد تھے۔ حضرت شاہ صلاح الدین صفوی گوپامئوی (تلمیذ رشید مولانا محمد اعظم سندیلوی و مرید و خلیفہ مولانا شاہ قدرت اللہ صفی پوری) سے بیعت وارادت رکھتے تھے۔

سرسید احمد خاں (متولد ۵/ذوالحجہ ۱۲۳۲ھ/ ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء۔ متوفی ۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء) نے آپ کا نام اس طرح تحریر کیا ہے۔

”اکمل افراد نوع انسی، مہبط انوار فیوض قدسی، سراب سرچشمۂ عین الیقین، مؤسس اساس ملت و دین، ماحیِ آثار جہل، ہادم بنائے اعتساف، محیِ مراسم علم، بانی مبانی انصاف، قدوۂ علمائے فحول، حاوی معقول و منقول، سند اکابرِ روزگار، مرجع اعالی و ادانی ہر دیار، مزاج دانِ شخص کمال، جامع صفاتِ جلال و جمال، مورد فیض ازل و ابد، مطرح انظار سعادت سرمد، مصداق مفہوم تمام اجزاے واسطۃ العقد، سلسلۂ حکمت اشراقی و مشائی، زبدۂ کرام، اسوۂ عظام، مقتداے انام، مولانا و مخدومنا مولوی فضل امام ادخلہ اللہ المنعام فی الجنۃ النعیم بلطفہ العمیم۔ (ص ۵۶۰۔ آثار الصنادید۔ مطبوعہ اردو اکاڈمی دہلی ۲۰۰۰ء)

آپ کا مختصر تعارف سرسید نے اس طرح تحریر کیا:

”مجال نہیں کہ آپ کے اوصاف حمیدہ اور محامدہ پسندیدہ تقریر کر سکے اگر ہزار برس مشق سخن کرے اور اسی ذکر میں زبان سخن سنجی سے معاف نہ رکھے، یقین ہے کہ ہزار سے ایک نہ ادا ہو سکے۔ علوم عقلیہ اور فنون حکمیہ کو ان کی طبع وقاد سے اعتبار تھا اور علوم ادبیہ کو ان کی زبان دانی سے افتخار۔ اگر ان کا فکر صائب براہین ساطعہ قایم نہ کرتا، اشکال ہندسہ تار

عنکبوت سے سست تر نظر میں آتیں۔

اس نواح میں ترویج علم حکمت و معقول کی اسی خاندان سے ہوئی۔ گویا اس دودۂ والا تبار سے اس علم نے یکجہتی بہم پہنچائی ہے۔ باوجود ان کمالات کے خُلق اور حلم کا کچھ حساب نہ تھا۔ ہمیشہ سرکار حکام وقت میں مناصب بلند سے سرفراز اور ابنائے عہد سے ممتاز رہے۔ پایۂ ہمت آپ کا بلند تھا اور سلوک آپ کا حق پسند۔ بہ سبب کثرت ایثار کے تنگیِ دست خلائق دیکھ نہ سکتے تھے اور بہ سبب خُلق وسیع کے ہر عاجز و زبوں حال کو عرض و نیاز سے منع نہ کرتے۔

اگرچہ وطن اصلی آپ کا خیرآباد ہے لیکن چند در چند اسباب سے حضرت نے شاہجہاں آباد میں اس طرح سے توطن اختیار کیا کہ گویا یہیں کے رؤسا میں سے محسوب ہونے لگے۔

ایک مدت مدید ہوئی کہ ترکِ روزگار کر کے بذات خود وطن مالوف کی طرف تشریف لے گئے۔ اگرچہ سب اھل و عیال کی یہاں بدستور بود و باش رہی اور جب سے گئے پھر معاودت نہ فرمائی۔ عرصہ انیس بیس برس کا ہوتا ہے کہ عالم فانی سے ملک باقی کی طرف سفر ناگزیر اختیار کیا۔ اور یہ واقعہ جانکاہ پانچویں ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ میں سانح ہوا۔

(ص ۵۶۱۔ آثار الصنادید از سرسید مطبوعہ دہلی ۲۰۰۰ء)

علامہ فضل امام خیرآبادی، علامہ سید عبدالواجد کرمانی خیرآبادی کے مایۂ ناز شاگرد اور نہایت ذہین و طباع تھے۔ علوم نقلیہ و عقلیہ کی تحصیل کے بعد دہلی جا کر صدر الصدور کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ کے سیکڑوں شاگردوں میں آپ کے فرزند علامہ فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ صدر الصدور دہلی زیادہ مشہور ہوئے۔ ۵ ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں آپ کا وصال ہوا۔ احاطہ درگاہ مخدوم شیخ سعد الدین خیرآبادی میں آپ کی تدفین ہوئی۔ مرزا غالب دہلوی نے آپ کی وفات کی خبر سن کر یہ اشعار کہے:

اے دریغا قدوۂ ارباب فضل　　کرد سوے جنت الماویٰ خرام

چوں ارادت از پے کسب شرف　　جست سالِ فوت آں عالی مقام

چہرۂ ہستی خراشیدم نخست تابنائے تخجہ گردد تمام
گفتم اندر، سایۂ لطف نبی باد آرا مش گہ فضل امام
۲۵۷ ۱۲۴۴ھ

(کلیاتِ غالب مطبوعہ ۱۹۲۰ء)

علامہ فضل امام کے والد ماجد حضرت قاضی محمد ارشد ہرگامی ایک فرشتہ صفت انسان تھے۔ حضرت شاہ احمد اللہ بن حاجی صفت اللہ محدث خیرآبادی سے بیعت تھے اور روحانیت میں بلند مرتبہ ومقام پر فائز تھے۔

مولانا عبدالشاہد شیروانی لکھتے ہیں کہ:

آپ (قاضی محمد ارشد ھرگامی) کے ایک صاحبزادے عالم جوانی میں فوت ہوگئے۔ بحالت نوعمری احکام شرعیہ کے پابند نہ تھے۔ اس لئے مولوی ارشد صاحب کو تشویش رہتی تھی۔ پیر ومرشد کی خدمت میں قلبی بے چینی ظاہر کی۔ پیر نے دعا کی۔ شب میں سرکار دوعالم ﷺ کی زیارت ہوئی کہ سرور رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام پکے باغ میں (جہاں مرحوم کی قبر تھی) تشریف لائے اور بیل کے درخت کے نیچے وضوفرمایا۔ بعد نماز فجر پیر ومرید دونوں ایک دوسرے کو مبارک باد دینے روانہ ہوئے۔ راستہ میں دونوں ملاقی ہوئے تو ایک دوسرے کو بشارت کا حال بتایا۔ وہیں سے دونوں پکے باغ میں پہنچے تو دیکھا کہ مقام معہود پر وضو کا اثر یعنی پانی کی تری موجود تھی۔

ایک عرصہ تک لوگ اس جگہ کی زیارت کرتے رہے۔ مولانا عبدالقادر بدایونی اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی ۱۳۰۹ھ میں اس مقام کی زیارت کے لئے بریلی سے خیرآباد پہنچے۔ اور مولانا حسن بخش کے مہمان ہوئے۔ مفتی فخرالحسن خیرآبادی جو اِن معزز مہمانوں کی زیارت میں شریک رہے تھے، حظیرہ کے اندر اس بیل کے درخت کی جگہ بتاتے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شفیق باپ نے فضل امام کی تربیت میں کیا کسر اٹھا رکھی ہوگی۔ (ص ۱۳۹، باغی ہندوستان مطبوعہ مبارکپور ۱۹۸۵ء)

بتیس (۳۲) واسطوں سے علامہ فضل حق عمری خیرآبادی کا شجرۂ نسب امیرالمؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے۔ علامہ فضل حق کے ایک مشہور مورثِ اعلیٰ شیرالملک بن عطاء الملک کے مورثان اعلیٰ کسی خطۂ ایران کے حاکم تھے۔ زوال حکومت کے بعد دولت علم سے انھوں نے اپنے آپ کو آراستہ کیا۔

''شیر الملک کے دو صاحبزادے بہاء الدین اور شمس الدین ذی علم بزرگ تھے۔اس وقت ہندوستان قدر دانیِ علما و مشاہیر میں خاص شہرت رکھتا تھا۔اہل کمال اِدھر کھنچ رہے تھے۔یہ دونوں بھائی ایران سے واردِ ہندوستان ہوئے۔ شمس الدین نے مسندِ افتاے رہتک (پنجاب) سنبھالی۔شاہ ولی اللہ بن شاہ عبد الرحیم محدث دہلوی انھیں کی اولاد سے تھے۔بہاء الدین قبۃ الاسلام بدایوں کے مفتی ہوئے۔ان کی اولاد میں شیخ ارزنی بدایونی نامور بزرگ اور اعلیٰ درجہ کے مفتی ہوئے ہیں۔شیخ عماالدین بن شیخ ارزانی تحصیل علم کی خاطر قاضی ہرگام (ضلع سیتاپور، اودھ) کی خدمتِ بابرکت میں پہنچے۔قاضی صاحب نے تحقیق شرافت و نجابت کے بعد اپنا داماد بنالیا۔قاضی صاحب کے انتقال کے بعد قاضیِ ہرگام بن گئے۔وہیں شیخ اسمٰعیل پیدا ہوئے جو اپنے نانا اور والد کے بعد قاضی بنے۔شیخ سعدی کاکوروی کی دختر سے شادی ہوئی جن سے قاضی صدر الدین پیدا ہوئے۔جن کا شمار مشاہیر وقت میں تھا۔

قاضی صدر الدین کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ایک صاحبزادے ملا ابو الواعظ، اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمہ کے اتالیق رہے اور فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین میں سے ہیں۔ھدایہ و مطول و ملا جلال پر حواشی لکھے۔ان کی شخصیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ملا قطب الدین شہید سہالوی (متوفی ۱۱۰۳ھ) (والدِ استاذ الکل ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی لکھنوی) ان سے ملاقات کے لئے ہرگام پہنچے تھے۔علامہ محبّ اللہ بہاری صاحبِ سلّم و مسلّم آپ کے درس میں شریک ہونا چاہتے تھے۔آپ کے پاس وقت نہ تھا اس لئے سہالی جاکر ملا قطب الدین شہید کے شاگرد ہوئے۔

دوسرے صاحبزادے ملا عبد الماجد کے خلف الصدق علامہ عبد الواجد فاضل جلیل تھے۔ کافیہ کی مبسوط شرح اور حاشیۂ اقلیدس لکھا۔علامہ عبد الواجد کرمانی خیرآبادی (استاذ مولانا فضل امام خیرآبادی) نے کتب خانہ ملا قطب الدین بن قاضی شہاب الدین گوپاموی المتوفی ۱۱۶۰ھ میں یہ حاشیۂ اقلیدس دیکھ کر فرمایا کہ:

من حواشیِ ملا کہ بر تحریر اقلیدس نوشتہ دیدہ ام بغایت خوب نوشتہ''۔

دختر قاضی صدر الدین سے نسلِ مفتیانِ گوپامؤ ہے۔اسی خاندان کے ایک علمی فرد مفتی انعام اللہ خان بہادر گوپاموی مفتیِ محکمۂ قضاۃ دہلی و معاصرِ علامہ (فضل حق) تھے۔یہ خاتون مفتی

عبیداللہ شہابی برادرِ کلاں ملا وجیہ الدین گوپاموی مؤلفِ ربع فتاویٰ عالمگیری کو بیاہی گئی تھیں۔
(ص ۱۳۱ و ۱۳۲۔ باغی ہندوستان)

علامہ فضل حق خیرآبادی جب خیرآباد سے ابتدائی تعلیم حاصل کر کے دہلی پہنچے تو ان کی تعلیم و تربیت اس طرح ہوئی کہ:

"والد ماجد مولانا فضل امام صدر الصدور دہلی نے مکان کے علاوہ ہاتھی اور پالکی پر بھی دربار آتے جاتے وقت ساتھ بٹھا کر درس دینا شروع کیا۔ علوم آلیہ میں صغر سنی ہی میں اپنا جیسا یگانہ روزگار بنا دیا۔ منقولات کی تحصیل کے لئے دربار حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی میں پہنچایا۔

علامہ فضل حق وہاں بھی ہاتھی پر ہی جاتے تھے۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ بھی ساتھ ہوتے تھے۔ رئیس زادہ ہونے کی وجہ سے کبھی خدمت گار کتاب ساتھ لے کر پہنچتا تو شاہ صاحب کشف سے مطلع ہو کر اس روز سبق نہ پڑھاتے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تعلیم کے ساتھ اس دربار میں تربیت کا بھی پورا لحاظ رہتا تھا۔ علم کی عظمت سکھائی جاتی تھی۔ استاذ کی وقعت کے طریقے بتائے جاتے تھے۔ (ص ۱۴۳۔ باغی ہندوستان)

"۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۰۹ء میں تیرہ سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم عقلیہ و نقلیہ و آلیہ کی تکمیل کی۔ چار ماہ اور کچھ روز میں قرآن مجید حفظ کیا۔

"تواتر سے یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے جب ردشیعہ میں "تحفۂ اثناعشریہ" محققانہ انداز میں تحریر فرمائی تو شیعان ہند کی طرح اہل تشیع ایران میں بھی ہیجان پیدا ہوا۔ ایران سے میر باقر داماد صاحب افق مبین کے خاندان کا متبحر عالم و مجتہد اونٹوں پر کتب فریقین بار کر کے شاہ صاحب سے مناظرہ کے لئے دہلی پہنچا۔ خانقاہ میں داخل ہونے پر شاہ صاحب نے فرائضِ میزبانی ادا فرماتے ہوئے مناسب جگہ قیام کے لئے تجویز فرما کر رختِ سفر کھلوایا۔

شام کو فضل حق حاضر ہوئے تو شاہ صاحب کو مصروفِ مہمان نوازی دیکھ کر کیفیت معلوم کی۔ تھوڑی دیر حاضرِ خدمت رہ کر بعد مغرب مجتہد کی خدمت میں پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد کچھ علمی گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔

مجتہد صاحب نے پوچھا۔ میاں صاحبزادے! کیا پڑھتے ہو؟

عرض کیا! شرح اشارات، شفا، اور افق مبین وغیرہ دیکھتا ہوں۔

مجتہد صاحب کو بڑی حیرت ہوئی۔ افق المبین کی کسی عبارت کا مطلب پوچھ لیا۔ علامہ نے ایسی مدلل تقریر کی کہ متعدد اعتراضات صاحبِ افق المبین پر کر گئے۔

مہمان نے اعتراضات کی جواب دہی کی کوشش کی تو ان کو جان چھڑانی اور بھی دوبھر ہوگئی۔ جب خوب عاجز کرلیا تو اپنے شبہات کے ایسے انداز میں جوابات دیے کہ تمام ہمراہی علما بھی انگشت بہ دنداں ہوگئے۔

آخر میں آپ نے یہ بھی اظہار کردیا کہ حضرت شاہ صاحب کا ادنیٰ شاگرد اور کفش بردار ہوں۔ اور اظہار معذرت کرتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

علمائے ایران نے اندازہ کرلیا کہ اس خانقاہ کے بچوں کے علم وفضل کا جب یہ عالم ہے تو شیخِ خانقاہ کا کیا حال ہوگا؟ صبح کو خیریت طلبیِ مہمان کے لئے شاہ صاحب نے آدمی بھیجا تو پتہ چلا کہ آخر شب میں وہ دہلی سے ہی روانہ ہوچکے ہیں۔ شاہ صاحب کو بڑی حیرت ہوئی۔ سبب ناخوشیِ مہمان معلوم کرنے کی کوشش کی تو فضل حق کی کرشمہ سازیوں کا راز کھلا۔ بلاکر بہت ڈانٹا کہ مہمان کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جاتا۔ وہ ہم سے گفتگو کرنے آئے تھے۔ ہم خود ان سے نبٹ لیتے۔ (ص ۱۴۵ و ۱۴۶۔ باغی ہندوستان)

تیرہ برس کی عمر سے ہی علامہ فضل حق نے تدریسی خدمت شروع کردی۔ والد ماجد علامہ فضل امام سے جو طلبہ تعلیم حاصل کرنے آتے انھیں علامہ فضل حق بھی پڑھاتے۔ بعد کے ادوار میں ملازمت اور تصنیف کے ساتھ بھی علامہ نے سلسلۂ تدریس منقطع نہ ہونے دیا اور جہاں رہے اپنا یہ علمی مشغلہ جاری رکھا۔ اس طرح ۱۸۰۹ء سے ۱۸۵۷ء تک کسی نہ کسی طرح یہ سلسلۂ تدریس باقی رہا اور نہ جانے کتنے تشنگانِ علوم آپ سے مستفید اور سیراب ہوتے رہے۔

والد ماجد علامہ فضل امام خیرآبادی کے انتقال (۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء) کے بعد جب کہ علامہ فضل حق کی عمر بتیس سال کی تھی اور اکبر شاہ ثانی کا دور تھا۔ دلی میں ریزیڈنٹ رہا کرتا تھا۔ آپ محکمۂ ریزیڈینسی میں سررشتہ دار ہوئے۔

دہلی کی شاہی حکومت ۱۸۰۳ء سے اور اودھ کی نوابی حکومت ۱۸۰۱ء سے انگریزوں کے زیر

اثر آ گئی تھی اور شاہ ونواب کے اوپر انگریزوں کی بالادستی قائم تھی لیکن برائے نام سہی مگر معاہدہ کے تحت قانونی حکومت دہلی میں مغل بادشاہ اور اودھ میں نواب اودھ کی ہی تھی اور حکومت کے مناصب اور عہدے پر فائز افراد ان شاہی ونوابی حکومتوں کے ہی اصل ملازم تھے۔ اس کے باوجود بہت سے عام مسلمان اور علما اس طرح کی ملازمتوں کو پسندیدہ نظر نہیں دیکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ اچھے گھرانے کے لوگ جب ملازمتیں کرنے لگے تو اس ناپسندیدگی میں کمی واقع ہوتی گئی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے جب اپنے داماد مولوی عبدالحی بڈھانوی کو میرٹھ کی ملازمت کی اجازت دے دی تو معاملہ کافی نرم ہو گیا اور لوگوں کی جھجھک دور ہوتی چلی گئی۔ البتہ خانقاہ حضرت شاہ غلام علی مجددی چتلی قبر دہلی کے مشائخ ان ملازمتوں کو خلاف ورع وتقویٰ سمجھتے ہوئے سرکاری ملازمین کے تحفے ونذرانے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا کرتے تھے اور اس وسیلۂ معیشت کو مشتبہ سمجھتے تھے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی نے ریزیڈینٹ کے محکمہ میں سررشتہ داری کے کچھ عرصہ بعد ریزیڈینسی کمشنری میں اپنے آپ کو تبدیل کرا لیا۔ لیکن طبعی طور پر علامہ کو یہ سرکاری ملازمت پسند نہ تھی اور حکام سے بھی آپ کا نباہ ہونا مشکل نظر آ رہا تھا اس لئے آپ نے اس ملازمت سے ۱۲۴۵ھ/۱۸۳۱ء میں استعفا دے کر اپنے آپ کو آزاد کر لیا۔

مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی لکھتے ہیں:

مولانا (فضل حق) نے حکام کا طریقہ خلاف مرضی پایا۔ مستعفی ہو گئے۔ نواب فیض محمد خاں رئیس جھجھر (پنجاب) کو جو معلوم ہوا انھوں نے پانچ سو روپے ماہوار مصارف کے لئے پیش کیا اور قدردانی کے ساتھ اپنے پاس بلایا۔

دہلی سے روانگی کے وقت ولی عہد سلطنت صاحب عالم مرزا ابوظفر نے اپنا ملبوس دوشالہ علامہ فضل حق کو اڑھایا اور بوقت رخصت آب دیدہ ہو کر کہا۔

چوں کہ آپ جانے کے لئے تیار ہیں میرے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کر لوں۔ مگر خدا علیم ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے۔ (پنج آہنگ از مرزا غالب)

علامہ ایک عرصہ تک نواب جھجھر کے پاس رہے۔ پھر مہاراجہ الور کے یہاں چلے گئے۔ یہاں سے سہارن پور گئے۔ پھر ٹونک میں نواب وزیر الدولہ نے بلا لیا۔ آخر میں لکھنؤ چلے آئے۔

یہاں صدر الصدور کے عہدے پر سرفراز ہوگئے۔ مولانا ایک عرصہ تک رام پور میں نواب یوسف علی خاں کے اتالیق اور محکمہ نظامت اور پھر مرافعۂ عدالتین پر مامور رہے۔ مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی سے ملنے کے بعد ۱۸۵۶ء میں الور چلے گئے۔ (ص ۴۸ و ۴۹۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما از مفتی انتظام اللہ شہابی۔ مطبوعہ دینی بکڈ پو اردو بازار دہلی ۶)

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اپنے دوست علامہ فضل حق کی جدائی اور ولی عہد خسروے دہلی صاحب عالم مرزا ابوظفر بہادر کے دردِ فراق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ودو شالۂ ملبوس خاص بدوشِ وے نہاد و آب در دیدہ گردانید و فرمود کہ

''ہرگاہ شما می گوئید کہ من رخصت می شوم مرا جز ایں کہ پذیرم گریز نیست۔

اما ایزد دانا داند کہ لفظِ وداع از دل بزبان نمی رسد اِلا بصد جرِ ثقیل''۔

(یادگار غالبؔ)

علامہ (فضل حق) اواخر ۱۸۱۵ء سے والد ماجد کے حکم کی تعمیل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمرۂ ملازمین میں شامل ہوگئے تھے مگر طبعاً یہ ملازمت ناپسند تھی۔ اس لئے ۱۸۱۸ء میں ایک خط والد ماجد کو لکھ کر اظہار بے زاری کیا۔ (بیاض مملوکہ حکیم نصیر الدین اجمیری ثم کراچوی) منشا پدری نہ پاکر سعادت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے ملازمت کا تلخ گھونٹ پیتے رہے۔ (ص ۱۵۱۔ باغی ہندوستان)

۱۸۳۱ء تک علامہ نے ملازمت کی اور سولہ سالہ ملازمت میں انگریزی عزائم کا آپ نے جس گہرائی سے مطالعہ کیا اس کا بیان آپ کے خودنوشت واقعات و حالات کے مجموعہ بنام "الثورة الهندية" میں جا بجا ملتا ہے۔

زمانۂ ملازمت میں علامہ نے سارے امور و معاملات نہایت زیرکی و دانائی سے انجام دیے۔ رام پور کے دوران قیام (۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء تا ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء) آپ نے مرزا غالبؔ کی شاعرانہ خوبیاں نواب رام پور سے اس طرح بیان کی تھیں کہ وہ مرزا غالبؔ کے مشتاق ہوگئے اور پھر ان کے باہمی روابط و تعلقات بھی استوار ہوگئے اور نواب نے مرزا غالبؔ پر نوازشیں بھی کیں۔ رام پور میں آٹھ برس گذارنے کے بعد علامہ لکھنؤ تشریف لے گئے جہاں آپ کو صدر الصدور بنایا گیا۔ ۱۸۴۸ء میں قائم شدہ ''حضور تحصیل'' لکھنؤ کے آپ مہتمم بھی مقرر ہوئے۔

یہاں بھی سارے فرائض آپ نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۶ء تک لکھنؤ میں علامہ کا قیام رہا۔ آپ کے اسی دور میں ۱۸۵۵ء میں مسجد ہنومان گڑھی اجودھیا کے معاملے میں مولانا امیر علی امیٹھوی لکھنوی کی شہادت معہ رفقا کا دل دوز حادثہ ہوا جس سے علامہ متاثر ہوئے۔ صدر الصدور لکھنؤ و مہتمم ''حضور تحصیل'' ہونے کی وجہ سے قیصر التواریخ میں سید کمال الدین حیدر عرف سید محمد زائر اور اس سے نقل کر کے تاریخ اودھ میں نجم الغنی خاں رام پوری نے بلاوجہ آپ کا نام گھسیٹا ہے جب کہ کسی فتویٰ پر آپ کا کوئی دستخط نہیں جس سے معلوم ہو کہ علامہ نے مولانا امیر علی کی مہم کو ناپسند بھی کیا ہو۔ البتہ واجد علی شاہ نواب لکھنؤ نے اس قضیہ کو حل کرنے کے لئے چند افراد پر مشتمل جو کمیٹی بنائی تھی اس کا ایک رکن آپ کو نامزد کیا تھا مگر اس کمیٹی کی کوئی میٹنگ ہی کبھی نہیں ہو سکی۔ اور اصل بات وہی ہے جو ۱۸۵۵ء میں حادثہ ہنومان گڑھی کے وقت کوتوالِ لکھنؤ نواب احمد یار خاں کے پوتے عشرت رحمانی نے لکھی ہے کہ:

> ''حضرت امیر المجاہدین مولانا امیر علی شاہ کی شہادت نے علامہ فضل حق کو بے حد متاثر کیا۔ اور ان کا دل انگریزی ڈپلومیسی اور جبر وظلم سے سخت متنفر ہو گیا۔ (ص ۱۲۳۔ آزادی کے نامور مجاہدین۔ مؤلفہ عشرت رحمانی۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۹۳ء)

اعلیٰ ظرفی وفیاضی وداد ودہش، دوستوں، ساتھیوں کے ساتھ حسن سلوک، ضرورت مندوں کی خبر گیری، طلبہ پر شفقت اور ہر قدم پر احساسِ ذمہ داری کے معاملے میں علامہ فضل حق خیرآبادی اپنی مثال آپ تھے۔

والد ماجد علامہ فضل امام خیرآبادی کے شاگرد شاہ غوث علی پانی پتی ایک بار رام پور آئے۔ سرائے میں قیام کیا۔ اتفاقاً علامہ فضل حق کی آپ پر نظر پڑ گئی۔

''علامہ نے بے انتہا اصرار سے اپنے پاس ٹھہرانے کی کوشش کی لیکن شاہ صاحب جو اکثر استغراق میں رہتے تھے اور تخلیہ کے خوگر تھے، آمادہ نہ ہوئے تو مالک سرائے سے کہلا بھیجا کہ شاہ صاحب کے تمام مصارف کا بل ہمارے پاس آئے اور جس قدر بھی خرچ ہو ان سے کچھ طلب نہ کیا جائے۔ (تذکرۂ غوثیہ)

مرزا غالبؔ کے تعلق سے گذر چکا ہے کہ علامہ کی تحریک وترغیب پر یوسف علی خاں نواب رام پور غالبؔ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ادھر علامہ نے غالبؔ کو لکھا کہ نواب کی خدمت میں قصیدۂ مدحیہ ارسال کیجیے۔ ۲۷؍ جنوری ۱۸۵۷ء کو علامہ کا مکتوب ملا اور ۲۸؍ کو غالبؔ نے اس کی فی الفور تعمیل کی۔ ۵؍ فروری کو نواب نے اپنے ایک مکتوب کے ساتھ چند اشعار بغرضِ اصلاح بھیجے۔ ۱۱؍ فروری کو غالب نے نواب کی مدح میں قصیدۂ مدحیہ بھیجا اور اس کی ایک نقل علامہ کو بھیجی جو انھیں انور میں ملی۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق نواب نے شاگردی میں شامل ہونے کے لئے شیرینی کی رقم دو سو پچاس روپے ارسال کیے۔ اس طرح نواب صاحب مرزا غالبؔ کے شاگرد ہو گئے۔

کرنل بشیر حسین زیدی سابق وزیر اعظم ریاست رام پور لکھتے ہیں:

...... نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب دہلوی کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آغاز ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی وساطت سے نواب فردوس مکان نے انھیں فنِ سخن میں اپنا مشیر خاص مقرر فرمایا تھا۔

ابتداءً نواب فردوس مکان (یوسف علی خاں) وقتی عطیات سے مرزا صاحب کی امداد فرماتے رہتے تھے۔ لیکن غدر کے بعد ان کی پنشن بند ہوگئی تو نواب صاحب نے جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپے ماہوار تنخواہ جاری فرمادی تھی جو ان کے انتقال کے بعد نواب خلد آشیاں کے خزانے سے ملتی رہی۔ اور مرزا صاحب کی وفات پر ان کے متبنیٰ حسین علی خاں شاداںؔ کے وظیفہ کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔ (ص ۸۔ دیباچۂ مکاتیب غالبؔ)

''مولوی فضل حق غالبؔ کے سب سے بڑے محبّ اور محسن تھے۔ انھوں نے نہ صرف مرزا کی شعر وسخن کے میدان میں رہنمائی کی جو ان کا اصل دائرۂ عمل تھا بلکہ ان کی مالی مشکلات دور کرنے کی بھی کوشش کی۔ (ص ۵۴۔ غالب نامہ از شیخ محمد اکرام)

علمائے دہلی میں حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ/ ۱۶۴۲ء) اور حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) کی مساعیِ جمیلہ سے علم حدیث کی نشر و اشاعت ہوئی اور پورا برصغیر ان حضرات کے فیوض وبرکات سے مستفید ہوا۔

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) وحضرت شاہ عبد القادر محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۴ء) فرزندانِ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی

۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) کے تلامذہ و منتسبین ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے اور تقریباً جملہ اکابر محدثینِ ہند کا رشتۂ تلمذ اس دور میں اور آج بھی انھیں حضرات سے منسلک ہے۔

اسی طرح معقولات میں ہندوستان کے معقولی علما بالعموم استاذ الکل حضرت ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی (متوفی ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء) کے تلامذہ یا تلامذہ کے تلامذہ اور ان کے خوشہ چیں ہیں۔

علامہ فضل حق خیر آبادی ان دونوں سرچشموں سے سیراب ہوئے اور یگانۂ روزگار و فخر اماثل واَقران ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ منقولات و معقولات اپنے اعتبار و استناد اور فیض رسانی کے لحاظ سے نہایت ممتاز و گراں قدر ہے جو ذیل کی ترتیب سے واضح ہے۔

(۱) علامہ فضل حق خیر آبادی (۲) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی و شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (۳) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۴) ابو الطاہر مدنی (۵) شیخ ابراہیم الکردی (۶) شیخ احمد القشاشی (۷) الشمس محمد بن احمد الرملی (۸) الزین زکریا الانصاری (۹) حافظ ابن حجر العسقلانی (۱۰) ابراہیم بن احمد التنوخی المعروف بالبرھان الشامی (۱۱) شیخ احمد بن طالب الحجاج (۱۲) ابو عبداللہ الحسین بن مبارک الزبیدی البغدادی (۱۳) ابو الوقت عبدالاول بن عیسیٰ بن شعیب بن اسحٰق السجزی الصوفی الھروی (۱۴) جمال الاسلام ابوالحسن عبدالرحمٰن بن محمد الداؤدی (۱۵) ابو محمد عبداللہ بن احمد بن حمویہ السرخسی (۱۶) ابو عبداللہ محمد بن یوسف مطر الفربری (۱۷) ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم البخاری۔

(۱) علامہ فضل حق خیر آبادی (۲) علامہ فضل امام خیر آبادی (۳) مولانا عبدالواجد کرمانی خیر آبادی (۴) مولانا محمد اعلم سندیلوی (۵) مولانا کمال الدین سہالوی (۶) استاذ الکل مولانا نظام الدین سہالوی متوفی جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء بانیِ درس نظامی و مورثِ اعلیٰ خانوادۂ علمائے فرنگی محل لکھنؤ (۷) ملا قطب الدین شہید سہالوی و ملا امان اللہ بنارسی (۸) ملا دانیال جوراسی (۹) مولانا عبدالسلام دیوی اودھی (۱۰) مولانا عبدالسلام لاہوری (۱۱) میر فتح اللہ شیرازی۔

مولانا عبدالشاہد شیروانی علامہ فضل حق خیر آبادی کے سلسلۂ درس و تدریس و تصنیف و تالیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

"علامہ فضل حق نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا۔ خاص اور

اہم مجبوریوں کے سوا کبھی اس سے تساہل نہ برتا۔ علامہ کی تصانیف درجنوں ہیں جن میں مشہور حسب ذیل ہیں:

(۱) الجنس الغالی شرح الجوہر المعالی (۲) حاشیۂ افق المبین (۳) حاشیۂ تلخیص الشفا (۴) حاشیہ شرح سلّم قاضی مبارک (۵) ھدیہ سعدیہ (۶) رسالہ تشکیک ماہیات (۷) رسالہ طبعی کلی (۸) رسالہ علم و معلوم (۹) الروض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود (۱۰) رسالہ قاطیغوریاس (۱۱) رسالہ تحقیق مایعم الاجسام (۱۲) رسالہ الثورۃ الھندیہ (۱۳) قصائد فتنۃ الھند (۱۴) مجموعۃ القصائد (۱۵) امتناع النظیر (۱۶) تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ (۱۷) شرح تہذیب الکلام۔

چار پانچ مصنفات کے سوا سب غیر مطبوعہ ہیں۔ ھدیہ سعدیہ اور حاشیۂ شرح سلم از قاضی مبارک کی جو شان ہے اس سے علما و طلبہ سبھی واقف ہیں۔ ھدیہ سعدیہ آج تک مدارس ہند و بیرون ہند میں داخل نصاب ہے۔ ہندوستان میں متعدد ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ مصر میں بھی چھپ چکی ہے۔ (ص ۱۸۱ و ۱۸۲۔ باغی ہندوستان)

رئیس احمد جعفری ندوی لکھتے ہیں:

> ھدیہ سعیدیہ محض ایک فنی کتاب ہے لیکن اس کی ایک ایک سطر مولانا کے ذوقِ ادب کی تصویر ہے۔ فقرے سانچے میں ڈھلے ہوئے نکلتے ہیں۔ الفاظ موتی کی طرح اپنی چمک دمک دکھاتے ہیں۔ انداز بیان کی فصاحت و بلاغت یہ محسوس بھی نہیں ہونے دیتی کہ ہم فلسفہ کے خارشان میں بادیہ پیمائی کررہے ہیں۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چمنستانِ ادب اور حدیقۂ معنی کے گلگشت میں مصروف ہیں۔ (ص ۸۷۰۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد۔ کتاب منزل لاہور ۱۹۵۷ء)

اپنی کتب و رسائل کے ذریعہ علامہ فضل حق خیرآبادی نے دین و ملت اور علم و فن کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ امتناع النظیر اور تحقیق الفتویٰ نے اس بھیانک سیلاب کے آگے بند باندھا جس نے امکان کذب باری تعالیٰ و امکان نظیر محمدی و تخفیفِ شانِ رسالت کے عقیدۂ فاسدہ کے ساتھ مسلم آبادیوں کو طرح طرح کے خطرات سے دوچار کردیا تھا۔ علاوہ ازیں غایۃ المرام مطبع علوی دہلی ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء جو بیانِ جواز میلاد و قیام مع مستحبات و مباحاتِ مروجہ پر مشتمل ہے اس

غایۃ المرام پر مولانا شاہ مخصوص اللہ دہلوی (متوفی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء) بن شاہ رفیع الدین دہلوی (متوفی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء) بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وحضرت شاہ احمد سعید مجددی (متوفی ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء) ومفتی صدرالدین آزردہ دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) وعلامہ فضل رسول عثمانی بدایونی (متوفی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) ومفتی شرف الدین مفتی ریاست رام پور (متوفی ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۲ء) ومفتی رضا علی خاں بریلوی (متوفی ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء) وغیرہم کے ساتھ علامہ فضل حق خیرآبادی کے بھی دستخط ہیں۔

علامہ فضل حق خیرآبادی کی معرکۃ الآرا کتاب ''امتناع النظیر'' کے بارے میں حکیم محمد نصیرالدین ندوی (نظامی دواخانہ۔شاہراہِ لیاقت، کراچی) لکھتے ہیں:

''اب ضرورت اس امر کی ہے کہ حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی کی کتاب مستطاب ''امتناع النظیر'' کا سہل وآسان ترجمہ کر کے ملک میں عام کردیا جائے تاکہ دنیا میں ایسا فتنہ (امکانِ نظیر محمدی) کبھی سر ہی نہ اٹھا سکے۔

حضرت علامہ مرحوم نے اس کتاب میں ایسے عقلی ونقلی دلائل جمع کردیے ہیں کہ عالم میں کوئی غبی سے غبی انسان بھی امکان نظیر کا قائل نہیں ہوسکتا۔

یہ کتاب دراصل علامہ مرحوم کی ذہانت وطباعی پر ایک روشن دلیل بھی ہے اور حضرت سرکار رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے علامہ مرحوم کی کمالِ وابستگی وغایتِ عقیدت وشیفتگی کا بیّن ثبوت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں شاہ اسمٰعیل دہلوی کی گستاخیوں پر علامہ مرحوم کے قلم میں انتہائی شدت وتلخی بھی آگئی ہے۔

یہ کتاب حضرت علامہ مرحوم نے دراصل اپنے تلمیذِ رشید مولانا ہدایت اللہ جون پوری کے نام سے ارقام فرمائی تھی۔ مولانا ہدایت اللہ صاحب کی دیانت اس امر کی متقاضی نہیں ہوئی کہ وہ حضرت علامہ کی کتاب اپنی ذات سے منسوب کرلیں اس لئے انھوں نے اپنے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان اشرف بہاری (صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے اِصرار پر مصنف (علامہ فضل حق) کا اصل مسوّدہ ہی مولانا سلیمان اشرف کے حوالے کردیا۔ (اور انھوں نے ہی اسے پہلی بار شائع کیا)

یہ جملہ باتیں مجھے مولانا سلیمان اشرف مرحوم ہی سے معلوم ہوئی ہیں۔ (ص ۱۷۰۔ امتیاز

حق ،مؤلفہ راجہ غلام محمد لاہور۔ طبع پنجم المجمع الاسلامی مبارک پور۔ ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء)

دورِ آخر میں سلسلۂ خیرآباد کے ایک مستند عالم مولانا سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی علامہ فضل حق خیرآبادی کی قلمی خدمات کے ایک اجمالی تبصرہ میں تحریر فرماتے ہیں:

علامہ کی زندگی کا بیشتر حصہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گذرا۔ اس کو زندگی کا دور اول کہنا مناسب ہے۔ اس دور میں آپ نے حاشیۂ قاضی جیسی نادرۂ روزگار کتاب لکھی جس کو معقولات کا فتاوی کہا جاتا ہے۔ مبحثِ وحدۃ الوجود میں ''الروض المجود'' تصنیف فرمائی جس میں عقلی دلائل سے اس مسئلہ کو ثابت فرمایا ہے۔ ''تہذیب الکلام'' کی شرح لکھی جو اپنے موضوع پر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے لیکن علامہ عبدالحق خیرآبادی کی وفات کے بعد اس کا نسخہ ضائع ہوگیا۔

......اس دور میں علامہ نے قلمی جہاد بھی کیا۔ مسئلہ امکانِ کذب اور مسئلہ امکانِ نظیر کے بطلان پر قلم اٹھایا اور دلائلِ قاہرہ سے ان کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے۔

چوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی رحمۃ للعلمین ، خاتم النبیین اور شفیع المذنبین ہے۔ جس پر سلف سے خلف تک تمام اہل سنت کا اتفاق ہے اور ان کے نزدیک آپ کی تعظیم وتکریم عینِ ایمان ہے۔ بالفاظِ دیگر — ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' پر اکابر امت کا اجماع وایقان ہے۔ اور مسئلہ امکان نظیر سے اس لازوال عقیدہ پر ضرب پڑتی تھی اور حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی خاتمیت معاذ اللہ مجروح ہوتی تھی اس لئے جذبۂ عشقِ نبوی نے علامہ کو بے قرار کردیا۔

علامہ حب نبوی میں ایسے سرشار تھے کہ تمام زندگی اپنے قصائد میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی کرتے رہے۔ وہ اپنی دنیوی اور اُخروی تمناؤں اور امیدوں کا مرکز ذات رسالت کو سمجھتے تھے، ایسے عقیدہ (امکانِ نظیر محمدی) کو کیسے برداشت فرماتے جس سے شانِ رسالت پر حرف آتا تھا؟ (ص ۱۷۷ و ۱۷۸ ۔ امتیاز حق ۔ مؤلفہ راجہ غلام محمد)

علامہ فضل حق خیرآبادی کی دوسری معرکۃ الآرا کتاب ''تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ'' اسی تقویۃ الایمان کے جواب میں ہے جس کے بارے میں اس کے مؤلف شاہ اسمٰعیل دہلوی کا خود یہ خیال وتاثر ہے کہ:

''میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس میں بعض جگہ ذرا تیز

الفاظ آ گئے ہیں اور بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا ہے۔ مثلاً ان امور کو جو شرکِ خفی تھے شرکِ جلی لکھ دیا گیا ہے۔ ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی اشاعت سے شورش ضرور ہوگی۔ .... گو اس سے شورش ہوگی مگر توقع ہے کہ لڑ بھڑ کر خود ٹھیک ہو جائیں گے۔ (ص ۹۸۔ حکایت ۵۹۔ حکایاتِ اولیا (ارواحِ ثلثہ) از مولانا اشرف علی تھانوی۔ مطبوعہ کتب خانہ نعیمیہ دیو بند)

شاہ اسمٰعیل دہلوی کی تقویۃ الایمان کے متعلق ایک سائل نے تحریری سوال کیا اور علامہ فضل حق نے ۱۸ ر رمضان ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۵ء میں تحقیق الفتویٰ کے نام سے اس کا تحریری جواب دیا۔ ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء میں پہلی بار مکتبہ قادریہ لاہور نے اردو ترجمہ مع متنِ فارسی کی طباعت واشاعت کی تاریخی خدمت انجام دی۔ تحقیق الفتویٰ پر شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ محمد موسیٰ بن شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ احمد سعید مجددی دہلوی، مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، مولانا محمد رشید الدین دہلوی وغیرھم کل سترہ ممتاز علماو مشائخ کرام کے تصدیقی دستخط اور مہریں ثبت ہیں۔

مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی نے ''امتناعِ نظیر'' کے نام سے ایک رسالہ لکھ کر امکان نظیر محمدی کی بدعتِ اعتقادی کا رد بلیغ کیا ہے۔ اس رسالہ کا قلمی نسخہ حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ومحفوظ ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پوتے شاہ مخصوص اللہ دہلوی نے ''سعید الایمان'' اور شاہ محمد موسیٰ دہلوی نے ''حجۃ العمل'' لکھ کر تقویۃ الایمان کے فاسد خیالات ونظریات کا رد وابطال کیا۔

تحقیق الفتویٰ کے اردو مترجم مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری (جامعہ نظامیہ لاہور) کلمۂ افتتاح کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں۔

''چوں کہ تقویۃ الایمان میں عامۃ المسلمین کو مشرک اور بدعتی قرار دیا گیا تھا اس لئے علماے اہل سنت نے اس کا سخت نوٹس لیا۔ یہاں تک کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بھی اس سے براءت وبیزاری کا اعلان کیا۔ مولانا مخصوص اللہ، مولانا محمد موسیٰ، حضرت شاہ احمد سعید مجددی، مفتی صدرالدین آزردہ، شاہ فضل حق خیر آبادی، شاہ عبدالمجید بدایونی اور شاہ فضل رسول بدایونی قدست اسرارھم ایسے اکابر معاصرین نے تقریر وتحریر کے ذریعہ ردِ بلیغ کیا۔ (ص ۴۹۔ تحقیق

الفتویٰ۔ مطبوعہ ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء۔ المجمع الاسلامی مبارک پور ضلع اعظم گڑھ، یوپی)

علامہ فضل حق خیر آبادی سرتا پا غرقِ بحرِ علم و حکمت اور سرچشمۂ فضل و کمال تھے اس لئے ہر چیز میں ان کی نگاہِ انتخاب ''جوھرِ علم'' پر جا کر ٹھہر جاتی تھی۔ چنانچہ

''جزیرۂ انڈمان میں بعض اسیرِ فرنگ علما نے دریافت کیا کہ ہندوستان میں کیا یادگار چھوڑی ہے؟ فرمایا! دو یادگاریں چھوڑ آیا ہوں۔ ایک حاشیۂ شرح سلّم قاضی مبارک اور دوسری یادگار برخوردار عبدالحق۔

اس جملہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساری تصانیف میں حاشیۂ قاضی پر علامہ کو کتنا فخر تھا اور ساری اولاد میں مولانا عبدالحق پر کتنا ناز تھا۔

کامل باپ کے کامل بیٹے کا انداز بھی دیکھ لیجیے۔ علامہ کے حاشیۂ قاضی کے بعض مسائل کی تشریح کے لئے مولانا عبدالحق سے اصرار کیا گیا۔ مولانا نے ایک ضخیم حاشیہ ازسرِ نو لکھ ڈالا (جو مدت ہوئی مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی نے چھپوایا تھا) لیکن علامہ کے حاشیہ پر قلم اٹھانا سوء ادب میں داخل سمجھا۔

اسی طرح نواب رام پور کے شدید اصرار پر علامہ کے نامکمل حاشیہ افق المبین کی تکمیل سے گریز کرتے ہوئے فرمایا:

> یہ ہوسکتا ہے کہ حاشیۂ قاضی کی طرح دوسرا حاشیۂ افق المبین بھی لکھ دوں۔ لیکن اس میں اضافہ ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگانا ہے۔ (ص ۱۸۴۔ باغی ہندوستان)

اسی طرح اپنے والد ماجد علامہ فضل حق کے بارے میں مولانا عبدالحق خیر آبادی (متوفی ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء) فرماتے تھے:

> ''میرے والد ماجد اور بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی بن ملا نظام الدین سہالوی صاحب درسِ نظامی کے درمیان "عام خاص من وجہٍ" کی نسبت ہے۔ معقولات میں تو مادۂ اجتماع ہے۔ فقہ اور ادب میں مادۂ افتراق ہے۔ اول کے ماہر مولانا بحر العلوم اور ثانی کے والد ماجد تھے۔ (ص ۱۸۵۔ باغی ہندوستان)

طرز تفہیم اور اساتذہ وطلبہ کے تعلقِ خاطر کے بارے میں مولانا شیروانی لکھتے ہیں:

''علامہ فضل حق کی تصانیف سے خاندانی طریقِ تعلیم اور طرز تدریس صاف نظر آتا ہے۔ عام طور سے اساتذہ کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ طالب علم سے عبارت پڑھوا کر تحت اللفظ ترجمہ کرادیا۔ پھر کچھ مطلب توضیح کے لئے بتادیا گیا۔

حضرت العلام مفتی محمد لطف اللہ علی گڑھی (شاگرد مفتی عنایت احمد کاکوروی) کے متعلق مشہور ہے کہ ترجمہ ایسا کراتے تھے کہ مطلبِ سبق ادا ہونے کے ساتھ ساتھ سارے اعتراضات و شبہات بھی دور ہوجایا کرتے تھے۔

مولانا عبدالحق ایک بار حیدرآباد میں مفتی صاحب کی ملاقات کو پہنچے تو سلسلۂ درس جاری تھا۔ مفتی صاحب کے اس کمال کو دیکھ کر بے حد تعریف کی۔

سلسلۂ خیرآباد میں عبارت پڑھوا کر خلاصۂ مطلب بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد لفظی ترجمہ کراکے لفظی مباحث کے بجائے تحقیقِ مسائل پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ زیادہ نافع اور باعثِ تسکینِ خاطر طلبہ ہے۔ اسی طرز تعلیم اور شفقت کا یہ نتیجہ ہے کہ شاگرد اپنے استاذ کا عاشق و فداکار نظر آتا ہے۔ ایک جاں نثار مرید کو اپنے پیر سے اتنی ہی عقیدت ہوسکتی ہے جتنی سلسلۂ خیرآباد کے تلامذہ کو اپنے اساتذہ سے ہوا کرتی ہے۔

علامہ (فضل حق) کے شاگرد رشید مولانا ھدایت اللہ خاں جون پوری (استاذ مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و مولانا امجد علی اعظمی مؤلف بہار شریعت) کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ استاذ زادہ مولانا عبدالحق خیرآبادی کا ملازم و خادم لاٹو جب کبھی جون پور پہنچ جاتا تھا اور مولانا اس کی آواز سن پاتے تھے تو پیرانہ سالی اور ضعفِ بصارت کے باوجود تعظیم کو کھڑے ہوجاتے۔ کھانا ساتھ کھلاتے۔ اور سفر خرچ وغیرہ دے کر عزت و مسرت کے ساتھ رخصت کرتے۔

مولانا حکیم برکات احمد بہاری ٹونکی طبیب خاص ریاست ٹونک (استاذ الاستاذ مولانا معین الدین ٹونکی اجمیری) کو زمانۂ تعلیم و قیام خیرآباد میں اپنے استاذ گرامی مولانا محمد عبدالحق خیرآبادی کے خدام کو بسا اوقات پورے مہینے کے مصارف کی رقم نذر کردینی پڑتی تھی۔ اور ٹونک سے دوسری بار روپیہ منگانا پڑتا تھا۔ مولانا حکیم دائم علی بہاری ریاست کے طبیب خاص تھے اور سو روپے ماہانہ

مصارف کے لئے بیٹے (برکات احمد) کو روانہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اکثر رقمیں آتی تھیں۔ (ص ۱۸۵ و ۱۸۶۔ باغی ہندوستان)

علامہ فضل حق خیر آبادی اپنے کمالِ علم و فضل کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا شاعرانہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ خیر آباد علما و صلحا کا مسکن تھا اور اپنی مردم خیزی و قرب لکھنؤ کی وجہ سے معدنِ شعرا تھا۔ آپ کے دور میں خیر آباد کے اندر اچھے اچھے شعرا پائے جاتے تھے۔

''علامہ خیر آباد سے دہلی پہنچے تو وہاں بھی یہی رنگ دیکھا۔ دارالسلطنت دہلی ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی کاملینِ فن کا مرکز تھی۔ ولی عہد صاحب عالم ابوظفر (بہادر شاہ ظفر) کی شعر و سخن سے دل چسپی نے زمینِ دہلی کو اور بھی رشکِ آسمان بنا دیا تھا۔

علامہ ریزیڈنٹ کے محکمہ کے سررشتہ دار ہو چکے تھے۔ ولی عہد سے دوستانہ مراسم تھے۔ قلعہ میں آمد و رفت رہتی تھی۔ بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر، مولوی امام بخش صہبائیؔ، علامہ عبداللہ خاں علوی، حکیم مومن خاں مومنؔ، مفتی صدر الدین آزردہؔ، مرزا اسد اللہ خان غالبؔ، نواب ضیاء الدین خاں نیرؔ، شاہ نصیر الدین نصیرؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، حکیم آغا جان عیشؔ، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسانؔ، میر حسن تسکینؔ، اور خدا جانے کتنے سخنورانِ باکمال کا جمگھٹا تھا۔ جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔ (ص ۳۱۲۔ گل رعنا از حکیم عبدالحی رائے بریلوی)

مرزا غالبؔ سے علامہ کے پر خلوص اور گہرے تعلقات تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ دونوں بالکل ہم سن تھے۔ دونوں ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہؔ ''ثالثِ ثلثہ'' تھے۔ یہ تینوں ایک جسم کے لئے اَبعادِ ثلثہ (طول، عرض، عمق) کا حکم رکھتے تھے۔ جس طرح جسم اپنے اَبعاد کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا اسی طرح ان تینوں کو جسمِ خلوص و محبت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مفتی صاحب دونوں سے آٹھ سال بڑے تھے۔ ''چراغ'' (۱۲۰۴ھ) تاریخِ ولادت ہے۔ اگر سنِ ولادت میں دونوں میں سے کسی کا ساتھ نہ دے سکے تھے تو سنِ وفات میں ایک کا ساتھ تو نہ چھوڑا۔ ''چراغِ دو جہاں بود'' (۱۲۸۵ھ) تاریخ وفات ہے۔ مرزا غالبؔ کا بھی سال رحلت یہی ہے۔ اور یہ بھی کیسا پُر لطف اتفاق ہے کہ مفتی صاحب علامہ سے آٹھ سال بڑے تھے۔ اور آٹھ سال بعد ہی دنیا سے رخصت ہوئے۔ علامہ کی وفات جزیرۂ انڈمان میں ۱۲۷۸ھ میں ہوئی۔

مرزا غالبؔ نے ولادت میں ایک دوست کا ساتھ دیا اور وفات میں دوسرے کا۔ (ص ۱۵۷۔ باغی ہندوستان)

مرزا غالبؔ کی شعر گوئی کا طرز سب سے جداگانہ تھا۔ طبیعت مشکل پسند واقع ہوئی تھی۔ علما وفضلا کی صحبت نے قابلیت میں اور چار چاند لگا دیے تھے۔ روزانہ کی صحبتوں میں مشکل وادق الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ مرزا جب شعر کہنے بیٹھتے تو انھیں مجالس کا خیال دامن گیر رہتا۔ مفتی صدرالدین آزردہؔ اور علامہ فضل حق خیر آبادی کی تنبیہ وھدایت پر مرزا غالبؔ کو اپنی مشکل پسندی کی روش ترک کرنی پڑی۔ آزردہؔ کا اثر تو مرزا غالبؔ نے کم لیا مگر علامہ کی تنبیہ وتفہیم کے بعد وہ قائل ہو گئے۔

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بڑا تھا۔ یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب فاضل بے عدیل تھے۔ ایک زمانہ میں دہلی میں سررشتہ دار تھے۔ اس عہد میں مرزا خانی کوتوال تھے۔ وہ مرزا قتیلؔ کے شاگرد تھے۔ نظم ونثر فارسی اچھی لکھتے تھے۔ غرض یہ کہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسہ اور شعر وسخن کے چرچے رہتے تھے۔

انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا جو کچھ کر چکا اب کیا تدارک ہو سکتا ہے؟ انھوں نے کہا خیر جو ہوا سو ہوا۔ انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو آج عینک کی طرح لوگ آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ (ص ۵۱۲۔ آب حیات از محمد حسین آزاد۔ مطبوعہ دہلی)

خواجہ الطاف حسین حالیؔ لکھتے ہیں:

''مولوی فضل حق سے مرزا کی رسم وراہ جب بہت بڑھ گئی اور مرزا ان کو اپنا خالص ومخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو انھوں نے اس قسم کے اشعار پر روک ٹوک کرنی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ انھیں کی تحریک سے انھوں نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا۔ دو ثلث کے قریب

نکال دیا۔ اور اس کے بعد اس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔ (یادگارِ غالب
از خواجہ حالیؔ، مطبوعہ دہلی)

مرزا غالبؔ نے اسی سے متاثر ہو کر یہ رباعی کہی تھی:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ لکھتے ہیں:

مولوی فضل حق خیرآبادی جیسی سخن فہم اور پاکیزہ ذوق ہستی سے بھی غالبؔ نے اس زمانے میں بہت کچھ حاصل کیا اور ان لفظی و معنوی تعقیدوں سے پرہیز کرنے لگے جو ان کے ابتدائی کلام میں بیدلؔ کی تقلید کا نتیجہ تھا۔ اگر مولوی فضل حق سے ملاقات نہ ہو جاتی تو شاید میر تقی میرؔ کی پیش گوئی کی دوسری شق پوری ہو جاتی جس میں انھوں نے کہا تھا کہ یہ لڑکا بھٹک جائے گا۔ (ص ۲۰۔ سرگذشت غالبؔ۔ طبع دوم حیدرآباد ۱۹۵۰ء)

شیخ محمد اکرام اس موضوع پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''مولانا فضل حق خیرآبادی جو علاوہ اپنی دینی اور علمی قابلیت کے اس لئے بھی یاد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے غالبؔ کو بیدلؔ کی تقلید سے روکا۔ اور اس کی ادبی تربیت کے لئے ایک استاد کامل ثابت ہوئے جو بقولِ میر تقی میرؔ مرزا کی شاعری کی نشوونما کے لئے ضروری تھا۔ (ص ۸۲۔ غالب نامہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۳۶ء)

خواجہ الطاف حسین حالیؔ لکھتے ہیں:

''مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا شعر ہے:

ہم چناں در تتقِ غیب ثبوتے دارند بوجودے کہ نہ دارندز خارج اعیاں

مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے ''ثبوتے'' کی جگہ ''نمودے'' لکھا تھا۔ مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سنایا تو انھوں نے کہا کہ اعیانِ ثابتہ کے لئے نمود کا لفظ نامناسب ہے اس کی جگہ ثبوت بنا دو۔ چنانچہ طبعِ ثانی میں بجائے ''نمود'' کے ''ثبوت'' بنا دیا ہے۔

(ص ۷۹۔ یادگارِ غالبؔ۔ مطبوعہ دہلی)

علامہ عربی و فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ فارسی میں فرقتیؔ آپ کا تخلص تھا۔ عربی کے ہزاروں اشعار آپ نے کہے ہیں جو ادب عربی کے شاہکار ہیں۔ سیکڑوں اشعار مولانا عبدالشاہد شیروانی نے ''باغی ہندوستان'' میں نقل کیے ہیں۔ معاصر شعرائے عرب کے کلام سے آپ کے کلام کا موازانہ کیا جائے تو مشاہیر عرب شعرا کی صف میں آپ نظر آئیں گے۔ آپ کے اشعار کی ایک بڑی تعدادو نعت شریف پر مشتمل ہے۔ مولانا شیروانی لکھتے ہیں:

''علامہ عربی اشعار حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ کو دکھاتے تھے۔ اوائل عمری کا واقعہ ہے۔ عرب کے مشہور اشعر الشعراء امرؤ القیس کے ایک قصیدے کے طرز پر قصیدہ لکھا۔ شاہ صاحب کو جا کر سنایا۔ مولانا شاہ غوث علی قلندر کا بیان ہے کہ شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا۔ اس کے جواب میں انھوں نے متقدمین کے بیس اشعار پڑھ دیے۔ مولانا فضل امام بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ وہ فرمانے لگے کہ بس حدِّ ادب۔

عرض کیا کہ حضرت! یہ کوئی علم تفسیر و حدیث تو ہے نہیں، فن شاعری ہے۔ اس میں بے ادبی کی کیا بات ہے؟ شاہ صاحب نے فرمایا: برخوردار تم سچ کہتے ہو۔ مجھ کو سہو ہوا ہے۔ تذکرۂ غوثیہ۔ (ص ۱۶۵و۱۶۶۔ باغی ہندوستان مؤلفہ عبدالشاہد شیروانی)

علامہ فضل حق خیر آبادی جہاں علم و فضل کے کوہِ وقار، ذہانت و فطانت کے پیکر، نجابت و شرافت اور حسنِ اخلاق و کردار کی چلتی پھرتی تصویر تھے وہیں وہ خوف و خشیتِ ربانی کے آئینۂ حق نما بھی تھے۔ مولانا عبدالشاہد شیروانی لکھتے ہیں:

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۴؍جون ۱۹۴۶ء کی صبح کو (مولانا عبدالشاہد شیروانی سے) بوقت ملاقات اپنے استاذ مکرم مولانا نظیر الحسن انبیٹھوی (تلمیذ مولانا محمد عبدالحق خیر آبادی فرزند علامہ فضل حق خیر آبادی) کی نسبت سے یہ روایت بیان کی کہ:

علامہ (فضل حق) نے وحدۃ الوجود پر جب رسالہ لکھا تو اہل علم و صاحب عرفان حضرات شدِّ رحال کر کے علامہ کی زبان سے اس کو سننے کے لئے حاضر ہوتے تھے اور اس معرکۃ الآرا مسئلہ کے حقائق و دقائق سن کر ان پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس رسالہ کے آخر میں جو توصیت فرمائی ہے اس سے خشیتِ ربانی اور قلبی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان خیرما یتواصیٰ بہ ان یتقی اللّٰہَ فی العلانیۃِ و السّر۔ و ان کنت فی ھذہ التوصیۃ ممن نسی نفسَہ و امر غیرَہ بالبرِ۔ فیا لھفی علیٰ امرٍ اتلفتہ و زمنٍ فی الھویٰ اسلفتہٗ و سوء عملٍ اخلفتہٗ و قدرٍ بالخلاعۃ وضعتہ و قدرٍ من البضاعۃ اضعتہٗ و ریعانٍ فی الزھو قبضتہ و عیشٍ فی اللھو امضیتہ۔
عفا اللّٰہ عنی و عنک و اذھب عنا بواسعۃ رحمتہٖ الضیق و الضنک۔ و وفقنا لصالح الاعمال و جمیل الفعال توفیقاً۔ و جعلنا مع الذین انعم علیھم من النبیین و الصدیقین و الشھداء و الصالحین۔ و حسنَ اولٰئِک رفیقاً۔

اس کا لفظ لفظ اعترافِ قصور اور خشیتِ رب غفور پر دلالت کر رہا ہے۔ فرماتے ہیں:

بہترین وصیت یہی ہو سکتی ہے کہ خدا سے ظاہر و باطن دونوں حالتوں میں ڈرتا رہے۔ اگر چہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے آپ کو بھول کر دوسروں کو نیکی کی ھدایت کرتا ہے۔

کس قدر افسوس ہے کہ میں اپنی عمر، اپنی خواہشات میں برباد اور اپنی زندگی بداعمالی میں تباہ کرتا رہا۔ اپنی عزت و توقیر، واہیات باتوں کی وجہ سے گراتا رہا اور اپنی پونجی کی بڑی مقدار مٹاتا رہا۔ حیات کے خوشگوار دن اترانے میں اور بہترین ایام لہو ولعب میں گذارتا رہا۔

خدا مجھے اور تمہیں معاف کرے اور اپنی رحمت کاملہ سے ان لغزشوں سے درگذر کرے۔ ہم سب کو اعمال نیک کی توفیق دے اور اپنے مقبول بندوں، انبیا، صدیقین، شہداء اور صالحین کا رفیق بنائے۔ اور یہی بہترین رفیق ہیں۔ (ص ۲۰۰ و ۲۰۱۔ باغی ہندوستان)

آپ کے شاگرد مولانا عبداللہ بلگرامی آپ کے اوصاف وخصائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اللہ کے دیے ہوئے ہاتھی، اونٹ اور عمدہ قسم کے گھوڑے اوامر ونواہی میں اطاعتِ خداوندی سے نہ روکتے تھے۔ آپ ان میں سے تھے کہ تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر میں حارج نہ ہو سکتی تھی۔

ہر ہفتہ ختم قرآن کرتے۔ نمازِ تہجد کی پابندی کرتے۔ جو شخص نوافل کا اس قدر التزام کرتا ہو

اس کے فرائض کا حال اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

آپ طلبہ پر نہایت شفقت فرماتے تھے اور ذہین و ذکی طلبہ کو پڑھانے میں حد درجہ شوق و دل چسپی رکھتے تھے۔ آسان اور سہل الفاظ میں طلبہ کو سمجھاتے تھے۔ حقائق کی تہ تک خود پہنچ جایا کرتے تھے۔ اور تعلیم وتدریس کے باب میں اپنے بیٹے اور دیگر طلبہ کے درمیان کوئی فرق و امتیاز روا نہ رکھتے تھے۔ (ترجمہ از عربی۔ مقدمہ ہدیہ سعدیہ)

علامہ فضل حق خیرآبادی کی اولاد و اخلاف کے بارے میں مولانا عبدالشاہد شیروانی لکھتے ہیں:

علامہ نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بی بی وزیرن دختر منشی فضل احمد بن حسین میاں تھیں۔ ان سے تین صاحبزادیاں بی بی سعد النساء حرماں والدۂ خان بہادر افتخار الملک منشی افتخار حسین مضطر خیرآبادی مرحوم و محمد حسین بسمل خیرآبادی مرحوم۔ بی بی نجم النساء والدۂ منشی ضمیر علی مرحوم فوجدار ریاستِ جے پور۔ مخمور النساء زوجۂ منشی طفیل احمد برادر منشی نیاز احمد بانی مدرسہ نیازیہ و رئیس خیرآباد۔ اور ایک صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی تھے۔ موصوف نے والد ماجد کے نام نامی کو اور گرامی بنایا۔ اور اس لائق شاگرد نے فائق استاد کو مزید بلند و بالا مقام پر پہنچایا۔ ۱۳۱۶ھ میں وفات پائی۔ درگاہ مخدوم شیخ سعد (خیرآباد) میں مسجد سے متصل فصیل کے نیچے محوِ خواب ہیں۔ دو سال کے بعد سعادت مند فرزند مولانا اسد الحق ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ کو راہی ملک بقا ہوئے۔ بادشاہ میاں کے باغ میں مدفون ہیں۔ اب صرف مولوی حکیم ظفر الحق خیرآبادی بن مولانا اسد الحق اس دودمانِ عالی کے تنہا چشم و چراغ ہیں۔ جو عمر کی تقریباً ساٹھ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ اطبائے خیرآباد کی صف اول میں آپ کا شمار ہے۔ (۱۹۷۸ء میں حکیم ظفر الحق کا انتقال ہوگیا)۔
(ص ۲۳۸۔ باغی ہندوستان)

علامہ کی دوسری اہلیہ جو دہلی کی تھیں ان سے دو صاحبزادے مولوی شمس الحق اور مولوی علاء الحق ہوئے۔ مولوی علاء الحق کے صاحبزادے مولوی ضمیر الحق ہوئے جن کے صاحبزادے مولوی فیض الحق (بھوپال) ہیں۔

سیکڑوں تلامذۂ علامہ خیرآبادی کی فہرست میں چند نمایاں نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

مولانا عبدالحق خیرآبادی بن علامہ فضل حق خیرآبادی۔ سعید النساء حرماں خیرآبادی بنت علامہ فضل حق خیرآبادی۔ مولانا ھدایت اللہ رام پوری ثم جون پوری، مولانا عبدالقادر عثمانی بدایونی، مولانا

فیض الحسن سہارن پوری، مولانا سلطان حسن بریلوی، مولانا ہدایت علی بریلوی، مولانا غلام قادر گوپامئوی، مولانا عبدالعلی رام پوری، مولانا عبداللہ بلگرامی، مولانا خیرالدین دہلوی، حکیم سید دائم علی ٹونکی، مولانا قلندر علی زبیری پانی پتی، مولانا حکیم سید احمد حسن امروہوی ثم اجمیری، مولانا محمد احسن گیلانی، مولانا نور احمد بدایونی، مولانا نورالحسن کاندھلوی، نواب یوسف علی خاں رام پوری، نواب کلب علی خاں رام پوری، مولانا قلندر بخش پانی پتی، مولانا عبدالحق کان پوری، مولانا عبدالعزیز سنبھلی، مولانا جمیل احمد بلگرامی، حکیم امام الدین دہلوی، مولانا نورالنبی رام پوری، مولانا محمد محسن ترہٹی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) کا سلسلۂ علم حدیث اور علامہ فضل حق خیرآبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) کا سلسلۂ علوم عقلیہ پورے برصغیر ہند و پاک میں آج بھی زندہ و تابندہ ہے جس کا مجموعہ مدارسِ اسلامیہ میں رائج درسِ نظامی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ علوم عقلیہ کی چمک دمک گردشِ زمانہ نے ماند کر دی ہے اور اس کے ماہرین رفتہ رفتہ معدوم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

ذیل میں ان دس منتخب علما و اساتذۂ کبار کا مختصر ذکر کیا جا رہا ہے جن کا دینی و علمی فیضان دور حاضر کے بیشتر اداروں اور درسگاہوں کے ذریعہ جاری ہے اور سلسلۂ خیرآباد کی برکتیں ان کے توسط سے ہر چہار جانب تقسیم ہو رہی ہیں۔ اور یہ سلسلۂ خیرآباد درحقیقت فرنگی محل لکھنؤ اور دانشگاہ عزیزی دہلی کا مجمع البحرین ہے۔

(۱) مولانا عبدالحق خیرآبادی (متولد ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ء۔ متوفی شوال ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء)

اپنے والد ماجد علامہ فضل حق خیرآبادی سے تعلیم و تربیت پا کر سولہ سال کی عمر میں درسیاتِ منقول و معقول کی تکمیل کی۔ ریاست الور اور دہلی میں اپنے والد ماجد کے ساتھ رہے۔ خیرآباد، ٹونک، رام پور، کلکتہ، حیدرآباد میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ حضرت شاہ اللہ بخش تونسوی سے سلسلۂ چشتیہ میں بیعت تھے۔ آخری عمر میں تصوف و طریقت کی طرف ساری توجہ مبذول و مرکوز ہو گئی تھی۔

مولانا عبدالشاہد شیروانی لکھتے ہیں:

لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم، نواب بشیرالدین احمد فاروقی خیرآبادی مرحوم، سید اخلاق الحسن مرحوم رئیس خیرآباد، منشی نذر محمد خاں اختر مرحوم، مولوی محمد فاروق نیر مرحوم، مولوی ظہیر احمد فاروقی، مفتی سید فخرالحسن، مولانا حکیم احمد علی، حکیم سید انوار حسین اور مولوی حکیم ظفرالحق

وغیرہم راوی ہیں کہ:

مولانا بے حد نفاست پسند اور نازک مزاج تھے۔ بڑے دبدبہ والے اور باوقار تھے۔ جو کوئی ملنے جاتا بڑی تواضع سے پیش آتے۔ اوقاتِ مقررہ کے علاوہ ملنے کی اجازت نہ تھی۔ علمی دربار میں پورے لباس کے ساتھ رونق افروز ہوتے۔ اہلِ مجلس پر چھائے رہتے۔ کوئی شوروغل نہ کرسکتا تھا۔ چیخ کر بات کرنا ممنوع تھا۔ نشست گاہ پر تکیہ اور مسند لگا رہتا۔ اردگرد قالین بچھے رہتے۔ باہر سے آنے والے مولانا کے دربار کو امیر کی مجلس سمجھتے۔ (ص ۳۲۱۔ باغی ہندوستان)

جرأت کا یہ عالم تھا کہ ایک قتل کے سلسلے میں آپ کے شاگرد رشید مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی پر الزام لگا دیا گیا۔ وہ مولانا کے پاس تھے۔ کوتوال رام پور وارنٹ لے کر حاضر ہوگیا۔ واقعہ معلوم ہونے پر کوتوال کے ساتھ نواب کی بھی خوب خبر لی کہ اسے بھی لے کر آتا جب مزہ معلوم ہوتا کہ طالب علم پر یہ جرأت کیسے کی جاتی ہے۔

کوتوال طیش میں بھرا ہوا نواب کے پاس پہنچا اور سارے الفاظ دہرا دیے۔ نواب مولانا کے ناز بردار اور قدرداں تھے۔ الٹے کوتوال پر ناراض ہوئے کہ مولانا نے میری توہین نہیں کی ہے بلکہ تو نے کی ہے۔ تو ایسے شخص کے پاس کیوں پہنچا جو نواب کو بھی برا بھلا کہہ سکتا ہے؟ اس توہین کا صرف تو ذمہ دار ہے۔ (ص ۳۲۴۔ باغی ہندوستان)

مولانا عبدالحق کی تصانیف داخل درس بھی ہیں۔ اکثر چھپ گئی ہیں۔

حاشیۂ قاضی مبارک، حاشیۂ غلام یحییٰ، حاشیۂ حمد اللہ، حاشیۂ میر زاہد امور عامہ، شرح ھدایۃ الحکمۃ، شرح مسلم الثبوت، شرح کافیہ (تسہیل الکافیہ)، شرح سلاسل الکلام، جواہر غالیہ، رسالہ تحقیق تلازم، شرح مرقاۃ، التحفۃ الوزیریہ، زبدۃ الحکمۃ، حاشیۂ عقائد عضدیہ، شرح الحواشی الزاھدیہ علیٰ ملا جلال، مشہور تصنیفات ہیں۔ تسہیل الکافیہ اور شرح زبدۃ الحکمۃ داخل نصاب ہیں۔ (ص ۳۲۴۔ باغی ہندوستان)

حکیم عبدالحیٔ رائے بریلوی سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ (متوفی ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء) آپ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وکان اماماً جوالاً فی المنطق و الحکمۃ، عارفاً بالنحو و اللغۃ، ذاسکینۃٍ و وقار، و وفور ذکاء و حسن تعبیر، و خبرۃ

بمسالكِ الاستدلال، و لطف الطبيعة و حسن المحاضرة، و ملاحة النادرة الیٰ حدٍ لايمكن الاحاطة بوصفهٖ، و مجالسته هی نزهة الاذهان و العقول، الخ. (ص۲۲۳. نزهة الخواطر جلد ثامن. مطبوعه اصح المطابع کراچی ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء)

ولہٗ مؤلفات مقبولة عندالعلماء، و فی عباراته قوة و فصاحة، و سلاسة تعشقها الاسماع و تلتذبها القلوب، و لكلامهٖ وقع فی الاذهان، (ص۲۲٤. نزهة الخواطر جلد ثامن)

مولانا عبدالحق خیرآبادی کے چند ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں:

حکیم سید عبدالعزیز سہارن پوری، حکیم سید برکات احمد ٹونکی، مولانا شاہ اعظم حسین مدنی، مولانا ظہورالحسن رام پوری، مولانا فضل حق رام پوری، مولانا اسدالحق خیرآبادی، مولانا علیم الدین شاہجہاں پوری، مولانا عبدالغنی رام پوری، مولانا سید علی بلگرامی، مولانا عبدالعزیز پنجابی، مولانا شائستہ گل (مردان)، حکیم احمد رضا خاں لکھنوی، محمد طیب مکی، مولانا نظیرالحسن انیٹھوی، مولانا مقیم الدین ٹونکی۔

آپ کے انتقال کے کچھ دن بعد نواب رام پور نے آپ کے صاحبزادے مولانا اسدالحق خیرآبادی (متوفی ربیع الآخر ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء) کو مدرسہ عالیہ رام پور کا پرنسپل بنایا۔ آپ کے بعد نسلی طور پر علم کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر اس سلسلۂ خیرآباد کی روحانی و معنوی اور علمی اولاد کی تعداد آج برصغیر ہندوپاک میں ہزاروں سے متجاوز ہے۔

مولانا عبدالحق خیرآبادی (متوفی ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء) نے آخر وقت یہ وصیت فرمائی کہ:

جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو میری قبر پر خبر کردی جائے۔ چنانچہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو رفیق محترم مولانا مفتی سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی نے مولانا کے مدفن (درگاہِ مخدومیہ خیرآباد) پر ایک جم غفیر کے ساتھ حاضر ہوکر میلاد شریف کے بعد فاتحہ خوانی کی۔

اور اس طرح پورے پچاس سال کے بعد انگریزی سلطنت کے خاتمہ کی خبر سنا کر وصیت پوری کردی۔ جزاهُ الله خير الجزاء۔ (ص۳۳۲۔ باغی ہندوستان)

(۲) مولانا ہدایت اللہ رام پوری ثم جون پوری (متوفی یکم رمضان ۱۳۲۶ھ/ ۲۷/ستمبر

۱۹۰۸ء) بن مولانا رفیع اللہ خاں روہیلہ رام پوری نے اپنے والد ماجد سے ابتدائی کتب پڑھنے کے بعد صرف ونحو کی تعلیم مولانا حافظ غلام علی سے حاصل کی۔ پھر معقولات کی تعلیم مولانا جلال الدین (متوفی ۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۶ء) سے اور حدیث کی مولانا سید عالم نگینوی (متوفی ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء) سے مکمل کی۔ علامہ فضل حق خیر آبادی سے رام پور میں منتھی کتابیں پڑھیں اور آپ کے گرویدہ ہو گئے۔

مدرسہ عالیہ رام پور میں مولانا ھدایت اللہ نے آغاز امر میں درس دیا اس کے بعد مفتی محمد یوسف فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء) کی جگہ ۱۸۷۰ء میں مدرسہ حنفیہ جون پور کے صدر مدرس بن کر تشریف لے گئے اور تاحیات وہیں علوم و معارف کے دریا بہاتے رہے۔ حضرت شاہ چھوٹے میاں قدس سرہ سے سلسلۂ عالیہ قادریہ میں بیعت تھے۔

حکیم عبدالحی رائے بریلوی (متوفی ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۳ء) لکھتے ہیں:

> الشیخ الفاضل الکبیر ھدایة اللّٰہ بن رفیع اللّٰہ الحنفی الرامفوری، احد العلماء المشھورین ولد و نشأ برامفور، و قرأ العلم علیٰ العلامة فضل حق بن فضل امام الخیرآبادی، و الصحاح الستة علیٰ السید عالم علی الحسینی النکینوی، ثم ولی التدریس بالمدرسة الامامیة الحنفیة ببلدة جونفور، فدرس و افاد بھا مدة عمرہ، اخذ عنہ خلق کثیر من العلماء، و انتھت الیہ رئاسة المنطق و الحکمة۔ الخ (ص ۵۲۰۔ نزھة الخواطر جلد ثامن)

مولانا محمد امجد علی اعظمی رضوی، مولانا یار محمد بندیالوی، سید سلیمان اشرف بہاری ثم علی گڑھی، مولانا عبدالسلام نیازی دہلوی، مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی، مولانا عبدالاول جون پوری آپ کے مشہور تلامذہ ہیں۔ مولانا شیر علی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد اور مولانا محمد ابراہیم بلیاوی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند بھی آپ کے شاگرد ہیں۔

(۳) مولانا عبدالقادر عثمانی بدایونی (متولد ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء۔ متوفی ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء) فرزند علامہ فضل رسول عثمانی بدایونی (متولد ۱۲۱۳ھ۔ متوفی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) علامہ فضل حق خیر آبادی کے

شاگرد رشید ہیں۔ اپنے عہد کے متبحر وجلیل القدر عالم وفاضل اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ حضرت سید شاہ آل رسول احمدی برکاتی مارہروی (متوفی ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء) سے بیعت واجازت وخلافت آپ کو حاصل تھی۔ مولانا مطیع الرسول محمد عبد المقتدر عثمانی بدایونی (متوفی محرم ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۵ء) اور عاشق الرسول محمد عبد القدیر عثمانی بدایونی (متوفی ۱۳۷۹ھ/ ۱۹۶۰ء) آپ کے فرزند ہیں۔

حکیم عبد الحی رائے بریلوی آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

الشیخ العالم الفقیه عبدالقادر بن فضل رسول العثمانی الحنفی الماتریدی البدایونی احد العلماء المشهورین فی بلاد الهند.

ولد ببلدة بدایون سنة ثلاث و خمسین و مأتین و الف و نشأ بها. و قرأ العلم علیٰ مولانا نور احمد البدایونی و العلامة فضل حق بن فضل امام الخیرآبادی، ثم سافر الیٰ الحرمین الشریفین فحج وزار، و اسند الحدیث عن الشیخ جمال عمر المکی، ثم رجع الیٰ الهند.

.... و لهٗ مصنفات، منها سیف الاسلام المسلول علیٰ المناع لعمل المولد و القیام، و احسن الکلام فی تحقیق عقائد الاسلام، و حقیقة الشفاعة لِأ هل السنة و الجماعة، و شفاعة السائل بتحقیق المسائل. مات سنة تسع عشرة و ثلاث مأة و الف ببدایون. (ص ۲۷۵ و ۲۷۶۔ نزهة الخواطر جلد ثامن)

مولانا عبد القادر عثمانی بدایونی کے والد ماجد علامہ فضل رسول عثمانی بدایونی اور علامہ فضل حق خیر آبادی کے درمیان برادرانہ تعلقات وروابط تھے۔ اپنی کتاب ورسائل مثلاً المعتقد المنتقد اور سیف الجبار وغیرہ میں علامہ فضل رسول نے کئی جگہ علامہ فضل حق کی تحریروں کے اقتباسات دیے ہیں اور آپ کی تعریف وتوصیف کی ہے۔ المعتقد پر علامہ فضل حق کی تقریظ بھی ہے۔ نیز مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی ومولانا شاہ احمد سعید مجددی نقشبندی کی بھی تقریظات ہیں۔

مولانا یعقوب حسین ضیاء القادری بدایونی لکھتے ہیں:

حضرت سیف اللہ المسلول مولانا فضل رسول بدایونی قدس سرہ سے علامہ فضل حق خیر آبادی کو نہایت خلوص وعقیدت تھی۔ ایک زمانے میں بدایوں بھی تشریف لائے تھے۔ اکثر اوراد واشغال کی اجازتیں حاصل کی تھیں۔ مدرسہ عالیہ قادریہ میں مقیم تھے۔ (ص ۸۹۔ جلد اول اکمل التاریخ مطبوعہ بدایوں)

(۴) مولانا فیض الحسن سہارن پوری (متولد ۱۲۳۲ھ/ ۱۸۱۶ء۔ متوفی ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء)

علامہ فضل حق خیر آبادی کے نامور تلامذہ میں سے تھے۔ علم وادب میں تبحر تام رکھتے تھے۔ تفسیر بیضاوی وتفسیر جلالین ومشکوٰۃ المصابیح پر آپ کے وقیع حواشی ہیں۔ سبعہ معلقہ اور دیوان حماسہ پر آپ کی لکھی ہوئی شرح آپ کے ذوق ومہارت عربی ادب کے بہترین اور معیاری نمونے ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت وارادت تھی۔ فن شاعری میں امام بخش صہبائی دہلوی کے شاگرد تھے۔ آپ نے زندگی بھر درس وتدریس کی خدمت انجام دی اور نہ جانے کتنے ماہرین علوم وفنون آپ کی درسگاہِ فضل وکمال سے پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۰ء میں اورینٹل کالج لاہور کے صدر شعبۂ عربی ہوگئے تھے۔ وہیں مولانا شبلی نعمانی نے آپ سے تعلیم حاصل کی۔ سید سلیمان ندوی کا آپ کے بارے میں یہ تأثر ہے کہ مولانا فیض الحسن سہارن پوری اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاک ہند نے صدیوں میں شاید اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو۔ (حیات شبلی، مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ)

حکیم عبد الحئی رائے بریلوی آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

الشیخ العالم الکبیر العلامة فیض الحسن بن علی بخش بن خدا بخش القرشی الحنفی السهارنفوری، کان من اعاجیب الزمان ذکاء و فطنة و علما، لم یکن فی عصره اعلم منه بالنحو و اللغة و الاشعار و ایام العرب و مایتعلق بها متوفرا علیٰ العلوم الحکمیة، و قرأ المختصرات علیٰ والده، ثم سافر الیٰ رام فور و اخذ عن العلامة فضل حق بن فضل امام الخیر آبادی و علیٰ غیره من العلماء، ثم [illegible] دهلی و اخذ الحدیث عن الشیخ احمد سعید بن [illegible] العمری الدهلوی، و تطبب علیٰ

الحکیم امام الدین، ثم صرف عمره فی الدرس و الافادة، ولی التدریس فی آخر عمره فی الکلیة الشرقیة "اورینٹل کالج" بلاهور۔ و انتهت الیه رئاسه الفنون الادبیة۔ الخ (ص۳٦٦ ۔ نزهة الخواطر، جلد ثامن)

درسِ حدیث حضرت شاہ احمد سعید مجددی رام پوری (متوفی ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء) سے لیا تھا۔ مولانا عبدالسمیع بیدلؔ رام پوری سہارن پوری (متوفی ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء) کی مشہور زمانہ کتاب ''انوار ساطعہ در بیان مولود و فاتحہ'' کو موافق و مؤید اہل سنت قرار دیتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

و مَن جاء مجلسه فلهٗ ان یقوم اِن قاموا واِلا فلا۔ و هکذا یقول المولوی احمد علی المحدث المرحم تبعاً لاستاذهٖ مولانا محمد اسحٰق المغفور (نور چهارم حصهٔ تصدیقات۔ انوار ساطعه)[1]

---

[1] یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ پایۂ حرمین حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی (متوفی ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۰ء) مولانا عبدالسمیع بیدلؔ رام پوری سہارن پوری (متوفی ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء) کے استاذِ مکرم اور حاجی الحرمین حضرت حاجی امداد اللہ فاروقی تھانوی مہاجر مکی (متوفی ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء) آپ کے مرشدِ اعظم ہیں۔ یہ دونوں حضرات مذہب اہل سنت، مسلک حنفیہ، مشرب صوفیہ کے اساطین وارکان ہیں۔ معمولات و مراسم سوادِ اعظم کے حامی و داعی ہیں۔ مولانا بیدلؔ رام پوری سہارن پوری کی معرکۃ الآرا کتاب ''انوار ساطعہ در بیان مولود و فاتحہ'' (طبع اول ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء، طبع دوم ۱۳۰۶ھ/ ۱۸۸۸ء) کے مؤید و مصدّق ہیں۔

ان دونوں حضرات کے ارشادات و تصدیقات نہایت اہم اور مسلمانانِ ہند کے لئے بے حد مفید ہیں اس لئے ان کے بعض حصے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں۔

فی الحقیقت نفسِ مطلب کتاب ''انوار ساطعہ'' موافقِ مذہب و مشربِ فقیر و بزرگان فقیر است۔ خوب نوشتید۔ جزا کم اللہ خیر الجزاء۔ ۲۲ رشوال ۱۳۰۴ھ مرقوم بنام مولانا عبدالسمیع بیدلؔ رام پوری (ص ۴۴۵۔ انوار ساطعہ طبع چہارم مبارک پور اعظم گڑھ ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء)

فقیر مجلس میلاد مبارک کا مع ہیئت کذائیہ معمولۂ علمائے ثقات و صلحا و مشائخ کرام بارہا اقرار کر چکا ہے اور اکثر اس کا عامل ہے۔ جیسا کہ فقیر کی دیگر تقریرات و تحریرات سے یہ مضمون ظاہر ہے۔ فقیر کو اس مجلس شریف کے باعثِ حسنات و برکات کے معتقد ہونے کے علاوہ یہ عین الیقین ہے کہ اس مجلس مبارک میں فیوض انوار و برکات و رحمتِ الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ ۲۰ ر رجب ۱۳۰۷ھ مرقوم بنام مولانا نذیر احمد رام پوری ثم حیدر آبادی (متوفی ۱۳۲۳ھ)۔ (ص ۴۲۳۔ نور چہارم۔ انوار ساطعہ)

دیکھو! ہندوستان میں سیکڑوں مذاہب کفریہ و عقائد باطلہ مخالفِ دین و بیخ کنِ اسلام ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ اور کیسے کیسے الزام و اعتراض و شہادت و شبہات و شکوک مذہب اسلام پر وارد کرتے جاتے ہیں۔ پس ایسے وقت میں آپس

(۵) حکیم سید برکات احمد ٹونکی (متولد ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء۔ متوفی ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) بن حکیم سید دائم علی (میر نگر ضلع پٹنہ، بہار) طبیب خاص دربار ریاست ٹونک نے ابتدائی تعلیم

بقیہ صفحہ ۵۱

کے مجادلہ کی جگہ اس کی تردید کرنی چاہیے اور قرآن شریف کی خوبیاں وفضائل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محامد و مکارمِ اخلاق ومحاسنِ اوصاف کو ہر مقام وہر شہر وقریہ میں نہایت زور وشور سے مشتہر کرنا چاہیے۔

ایسے وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محامدِ اوصاف ومکارمِ اخلاق کو مشتہر واشاعتِ عام کرنے کے لئے ہر مقام میں مجلسِ مولود شریف کا چرچا بڑا عمدہ ذریعہ ومستحسن وسیلہ ہے۔

ذوالقعدہ ۱۳۰۷ھ۔ مرقوم بنام مولانا محمود حسن دیوبندی ومولانا خلیل احمد انبیٹھوی سہارن پوری۔ (ص ۴۲۴۔ انوار ساطعہ)

پایۂ حرمین مولانا رحمت اللہ کیرانوی علیہ الرحمہ والرضوان (متوفی ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء) تحریر فرماتے ہیں:

...... میرے اساتذۂ کرام اور میرا عقیدہ مولد شریف کے باب میں قدیم سے یہی تھا اور یہی ہے۔ بلکہ بہ حلف سچ سچ ظاہر کرتا ہوں کہ میرا ارادہ یہ ہے کہ ع بریں زیستم، ہم بریں بگذرم۔

اور عقیدہ یہ ہے کہ انعقادِ مجلس میلاد بشرطے کہ منکرات سے خالی ہو۔ جیسے تغنی اور باجہ اور کثرت سے روشنی بے ہودہ نہ ہو۔ بلکہ روایاتِ صحیحہ کے موافق ذکر معجزات اور ذکر ولادتِ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا جاوے اور بعد اس کے طعام پختہ یا شیرینی بھی تقسیم کی جاوے اس میں کچھ حرج نہیں۔

بلکہ اس زمانے میں جو ہر طرف سے پادریوں کا شور اور بازاروں میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دین کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف سے آریہ لوگ۔ خدا ان کو ہدایت دے۔ جو پادریوں کی طرح بلکہ ان سے زیادہ شور مچا رہے ہیں، ایسی محفل کا انعقاد ان شروط کے ساتھ جو میں نے اوپر ذکر کیں اس وقت فرضِ کفایہ ہے۔

میں مسلمان بھائیوں کو بہ طور نصیحت کے کہتا ہوں کہ ایسی مجلس کرنے سے نہ رُکیں اور اقوالِ بے جا منکروں کی طرف سے جو تعصب سے کہتے ہیں ہرگز التفات نہ کریں۔

اور جواز اس کا بہ خوبی ثابت ہے۔ اور قیام وقت ذکرِ میلاد کے چھ سو برس سے جمہور علمائے صالحین نے، متکلمین اور صوفیۂ صافیہ اور علمائے محدثین نے جائز رکھا ہے۔ اور صاحبِ رسالہ نے اچھی طرح ان امور کو ظاہر کیا ہے۔

اور تعجب ہے ان منکروں سے، ایسے بڑھے کہ فاکہانی مغربی کے مقلد ہو کر جمہور سلفِ صالح کو متکلمین اور محدثین اور صوفیہ سے ایک ہی لڑی میں پرو دیا اور ان کو ضال مضل بتایا۔

اور خدا سے نہ ڈرے کہ اس میں ان لوگوں کے استاد اور پیر بھی تھے۔ مثل حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی، اور ان کے صاحبزادے شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین دہلوی، اور ان کے بھائی شاہ عبدالعزیز دہلوی، اور ان کے نواسے حضرت مولانا محمد اسحٰق دہلوی قدس اللہ اسرارہم۔ سب کے سب انھیں ضال مضل میں داخل ہوئے جاتے ہیں۔

اُف! ایسی تیزی پر، کہ جس کے موافق جمہور متکلمین اور محدثین اور صوفیہ سے حرمین اور مصر اور شام اور یمن اور دیارِ عجمیہ میں لاکھوں گمراہی میں ہوں۔ اور یہ حضراتِ چند ہدایت پر۔ اللہ ہمیں اور ان کو ہدایت کر۔ اور سیدھے رستے پر چلا۔ آمین ثم آمین ۔ الخ (ص ۴۲۱۔ نور چہارم۔ انوار ساطعہ در بیان مولود وفاتحہ۔ مرتبہ مولانا عبدالسمیع بیدلؔ رام پوری سہارن پوری۔ طبع چہارم مبارک پور ضلع اعظم گڑھ ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء)

مولانا محمد احسن گیلانی (متوفی ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء) شاگرد علامہ فضل حق خیر آبادی اور مفتی نعمت اللہ بن نور اللہ لکھنوی سے حاصل کی۔ درس حدیث مولانا سید عالم نگینوی سے لیا۔ کچھ دن اجمیر شریف رہ کر ٹونک پہنچے۔ نواب محمد علی خاں والی ریاست ٹونک کے ولی عہد حافظ ابراہیم خاں خلیس کے اتالیق مقرر ہوئے۔

ایک مدت بعد ریاست رام پور کا سفر کر کے مولانا عبدالحق خیر آبادی فرزند علامہ فضل حق خیر آبادی کی خدمت میں پندرہ سال تک تعلیم و تربیت پائی۔ پھر ایک سال تک ریاست بھوپال میں قیام کر کے مولانا محمد ایوب پھلتی قاضی ریاست بھوپال سے علم حدیث پڑھا۔ اس کے بعد ٹونک واپس آئے۔

مولانا عبدالشاہد شیروانی آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

زندگی کا پہلا حصہ درس و افادہ تھا۔ دوسرے حصے میں تصنیف و تالیف کا ذوق غالب ہوا۔ آخر عمر میں ہر چیز سے الگ ہو کر صرف اس مشغلہ میں ڈوب گئے جس کے لئے بنائے گئے تھے۔ کل عمر ۶۷ سال کی ہوئی۔ شروع میں مدرس تھے پھر مصنف ہوئے اور آخر میں وہ ایک صوفی صافی درویش نیک سیرت تھے۔ (ص ۳۵۰۔ باغی ہندوستان)

طلبہ پر شفیق و مہربان تھے۔ درس گاہ میں عظمت و وقار کا غلبہ رہتا تھا اور مجلسی گفتگو آپ کی پر لطف ہوا کرتی تھی۔ عشق نبوی اور اخلاص و تقویٰ آپ کا شعار تھا۔ رات کے تین ساڑھے تین بجے اٹھ کر تہجد اور اوراد و ظائف میں مصروف ہو جاتے۔ تلاوت قرآن اور دلائل الخیرات کا ورد آپ کا معمول تھا۔

آپ کے ممتاز تلامذہ یہ ہیں:

مولانا معین الدین اجمیری، مولانا خلیل الرحمٰن ٹونکی، مولانا نصیر احمد پھلتی، مولانا عبدالرحمٰن چشتی حیدر آبادی، مولانا اشرف ملتانی، مولانا عبدالسبحان بہاری، مولانا مقبول احمد دربھنگوی، مولانا محمود سندھی، مولانا عبیداللہ الاصم بہاری، مولانا عبدالحمید ترہتی، مولانا محمد شریف مبارک پوری، مولانا عبدالقدیر بدایونی، مولانا فضل رحیم بہاری، مولانا احمد کریم بہاری، مولانا عبدالواسع حیدر آبادی، مولانا مناظر احسن گیلانی وغیرہم۔

آپ کے فرزند مولانا حکیم محمد احمد ٹونکی علم و عمل میں آپ کے جانشین تھے۔ جو آپ کے

وصال کے دو تین سال بعد ہی سفر آخرت پہ روانہ ہو گئے۔ آپ والی ریاست ٹونک کے طبیب خاص اور دار العلوم نظامیہ خلیلیہ ٹونک کے صدر المدرسین تھے۔ مولانا حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) اور مولانا مسعود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) آپ ہی کے فرزند ہیں۔

(۶) امام احمد رضا بریلوی (متولد ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء۔ متوفی ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) نے ریاضی و ہیئت کی تعلیم مولانا عبد العلی رام پوری شاگرد علامہ فضل حق خیر آبادی سے حاصل کی۔ آپ کے آباو اجداد قبیلۂ بڑھیچ سے تھے جو روہیلہ کی ایک شاخ ہے اور اسی نسبت سے بریلی و رام پور و بدایوں و شاہجہاں پور وغیرہ کو روہیل کھنڈ کہا جاتا ہے۔ والد ماجد مولانا نقی علی خاں بریلوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) سے آپ نے علوم نقلیہ و عقلیہ کی تعلیم پائی تھی۔ حضرت مولانا عبد القادر عثمانی بدایونی (متوفی ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء) شاگرد علامہ فضل حق نے آپ کے والد ماجد کے ساتھ آپ کو مارہرہ مطہرہ لے جا کر حضرت سید شاہ آل رسول احمدی مارہروی (متوفی ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء) تلمیذ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) سے ۱۲۹۴ھ میں بیعت کرایا تھا اور اسی وقت آپ اجازت و خلافت سے نوازے گئے تھے۔ آپ کے دادا حضرت مولانا رضا علی خاں بریلوی (متوفی ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء) جلیل القدر عالم و مفتی اور بطلِ حریت تھے۔

امام احمد رضا بریلوی عاشق رسول، حسان الھند، فقیہ اسلام اور کثیر التصانیف عالم دین کی حیثیت سے مسلمانانِ ہند کے لئے سرمایۂ افتخار ہیں۔ فقہ حنفی کا انسائیکلوپیڈیا ''فتاویٰ رضویہ'' آپ کا دینی و علمی شاہکار ہے۔ آپ کے صاحبزادگان مولانا محمد حامد رضا بریلوی (متوفی ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) و مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی (متوفی ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۱ء) علم و فضل میں آپ کے پرتو تھے۔

خلفِ اصغر مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی کے اساتذہ میں مولانا رحم الٰہی بنگلوری (متوفی ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) تلمیذ مولانا سید عبد العزیز انبیٹھوی سہارن پوری (متوفی ۱۳۴۴ھ) تلمیذ علامہ عبد الحق خیر آبادی (متوفی ۱۳۱۶ھ) اور مولانا ظہور الحسین فاروقی رام پوری (متوفی ۱۳۴۲ھ) تلمیذ علامہ عبد الحق خیر آبادی و شاہ فضل رحمٰن مراد آبادی شامل ہیں۔ اسی طرح مولانا سید بشیر احمد علی گڑھی تلمیذ مفتی لطف اللہ علی گڑھی تلمیذ رشید مفتی عنایت احمد کاکوروی بھی آپ کے استاد گرامی قدر ہیں۔

مولانا سید محمد دیدار علی الوری ثم لاہوری (متوفی ۱۳۵۴ھ ۱۹۳۵ء) مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی (متوفی ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) مولانا محمد امجد علی اعظمی رضوی (متوفی ۱۳۶۷ھ/

۱۹۴۸ء) مولانا سید محمد محدث اشرفی کچھوچھوی (متوفی ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء) مولانا ضیاء الدین احمد مہاجر مدنی (متوفی ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء) مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی (متوفی ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء) ابوالحسنات مولانا سید محمد احمد قادری لاہوری (متوفی ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۱ء) مولانا ظفرالدین قادری رضوی (متوفی ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء) مفتی محمد عبدالباقی برہان الحق جبل پوری (متوفی ۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء) وغیرہم امام احمد رضا بریلوی کے ممتاز خلفا و تلامذہ ہیں۔

(۷) مولانا محمد امجد علی اعظمی رضوی (متولد ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء۔ متوفی ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) شاگرد مولانا ہدایت اللہ جون پوری (۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) تلمیذ علامہ فضل حق خیرآبادی و شاگرد مولانا وصی احمد محدث سورتی (متوفی ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء) و خلیفۂ امام احمد رضا بریلوی (متوفی ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) تکمیل علوم نقلیہ و عقلیہ (۱۳۲۴ھ) کے بعد سب سے پہلے مدرسہ اہل سنت پٹنہ اس کے بعد دارالعلوم منظر اسلام بریلی میں بعہدۂ صدر المدرسین خدمت تدریس پہ مامور ہوئے اور آپ ہی کی کوشش سے امام احمد رضا بریلوی نے ۱۳۳۰ھ ۱۹۱۱ء میں شہرۂ آفاق ترجمۂ قرآن (کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن) مکمل کیا۔ ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۵ء میں دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف اور ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۶ء میں دارالعلوم حافظیہ سعیدیہ دادوں ضلع علی گڑھ کے صدر مدرس ہوئے۔

دارالعلوم معینیہ اجمیر شریف کے عہد تدریس میں آپ کے جو باکمال شاگرد پیدا ہوئے ان میں سے چند حضرات یہ ہیں۔ مولانا سردار احمد قادری رضوی لائل پوری (متوفی ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء)، مولانا شاہ عبدالعزیز محدث مبارک پوری (متوفی ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء) مولانا محمد حبیب الرحمٰن قادری اڑیسوی (متوفی ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء) مولانا سید غلام جیلانی میرٹھی (متوفی ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء) مولانا غلام یزدانی اعظمی (متوفی ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء) مفتی رفاقت حسین مظفرپوری (متوفی ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء) قاضی شمس الدین جعفری جون پوری (متوفی ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء) وغیرہم۔

بہار شریعت اور فتاویٰ امجدیہ آپ کی فقہی یادگار ہیں جن سے ہزاروں علما و طلبہ اور لاکھوں مسلمان استفادہ کرتے ہیں۔ آپ کی علمی و تدریسی مہارت کا اعتراف بڑے بڑے علما و دانشوروں نے کیا ہے۔ صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی علی گڑھی کا تاثر یہ ہے کہ:

> "میرا جو ذاتی تجربہ ہے وہ یہ ہے کہ جس کو مدرس کہتے ہیں وہ ہندوستان میں چار پانچ سے زائد نہیں۔ ان چار پانچ میں سے ایک مولوی امجد علی

صاحب ہیں۔ (ص ۵۔ روداد مدرسہ حافظیہ سعیدیہ دادوں ضلع علی گڑھ بابت ۵۸۔ ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء)

فروری ۱۹۲۶ء میں شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لئے تدوین و ترتیب نصاب کمیٹی اور اس کی مٹنگوں کے شرکا میں یہ حضرات تھے۔ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا سید سلیمان اشرف صاحب صدر علوم شرعیہ مسلم یونیورسٹی، مولانا مناظر احسن گیلانی استاذ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، مولانا امجد علی صاحب مدرس مدرسہ معینیہ اجمیر، سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالعزیز میمن۔

آپ کے بارے میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔ ''جدید ضرورتوں سے آگاہ، نصاب ہائے تعلیم اور درس گاہوں کے تجربہ کار عالم۔'' (ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۶ء)

دینی وعلمی مہارت وبصیرت اور تفقہ کی وجہ سے آپ کا لقب ''صدر الشریعہ'' تھا۔ آپ کے وصال کے بعد شاعر مشرق شفیق جون پوری اسی لقب سے آپ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سلامی جابجا ارض و سما دیں مہ و خورشید پیشانی جھکا دیں
ترے خدام اے ''صدرِ شریعت'' جدھر جائیں فرشتے پر بچھادیں

(۸) مولانا یار محمد بندیالوی (متولد ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء۔ متوفی محرم ۱۳۶۷ھ/ دسمبر ۱۹۴۷ء) نے اپنے وطن بندیال ضلع سرگودھا صوبہ پنجاب کے قریبی مدارس میں ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ نعمانیہ لاہور اور مسجد فتح پوری دہلی میں تعلیم پائی۔ مزید تکمیلِ درسیات کے لئے بریلی حاضر ہوئے۔ اور امام احمد رضا بریلوی کے ارشاد پر عمل کرتے ہوئے جون پور پہنچ کر مولانا ہدایت اللہ تلمیذ علامہ فضل حق خیر آبادی سے منتھی کتابیں پڑھیں۔ اور وہیں مدرس بھی ہو گئے۔ پھر الہ آباد، رام پور، بھوپال، ٹونک میں بائیس سال تک مدرس رہے۔ آخر میں اپنے وطن آئے اور یہاں تیس سال تک طلبہ کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہے۔

جملہ علوم نقلیہ وعقلیہ بالخصوص علم فقہ میں آپ کی مہارت بے نظیر تھی۔ آپ کے سیکڑوں تلامذہ میں سے چند حضرات کے نام درج ذیل ہیں۔

مولانا محمد عبدالغفور ہزاروی، مولانا عطا محمد بندیالوی، مولانا سید سلیمان اشرف، مولانا محمد عبدالحق بندیالوی، مولانا محمد سعید (واں بھچراں) مولانا عبدالرحیم (کاشغر)، مولانا عبدالخالق (سوات) وغیرھم۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (متوفی ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء) کے خلیفۂ ارشد صوفی محمد حسین الٰہ آبادی (متوفی ۸؍ رجب ۱۳۲۲ھ/ ۱۹؍ ستمبر ۱۹۰۴ء) سے آپ نسبتِ بیعت و ارادت رکھتے تھے۔ ڈھائی سال تک حضرت صوفی صاحب کی خدمت میں استفادہ و استفاضہ کر کے تصوف و سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے۔ خلافت و اجازت سے بھی نوازے گئے۔

(۸) مولانا سید سلیمان اشرف (متولد ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء۔ متوفی ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء) بن حکیم سید محمد عبد اللہ محلّہ میر داد پٹنہ، بہار نے مدرسہ حنفیہ جون پور میں مولانا ہدایت اللہ رام پوری ثم جون پوری تلمیذ علامہ فضل حق خیر آبادی سے تعلیم حاصل کی اور ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں استاد دینیات مقرر ہوئے۔ مفتی اعجاز ولی رضوی بریلوی (متولد ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء۔ متوفی ۱۳۹۳ھ/ ۱۹۷۳ء) شیخ الحدیث جامعہ نعمانیہ لاہور کی روایت (ص ۳۱؍ مقالات یوم رضا لاہور۔ حصہ سوم ۱۹۷۱ء) کے مطابق مولانا سید سلیمان اشرف اپنے مرشدِ خلافت امام احمد رضا بریلوی (متوفی ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) کی ہدایت کے مطابق مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وابستہ ہوئے۔

المبین، الانہار، الحج، النور، الرشاد آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ عربی زبان و ادب کی جامعیت و انفرادیت پر لکھی گئی آپ کی کتاب المبین پڑھ کر علامہ اقبال نے اس کی تعریف کرتے ہوئے سید سلیمان اشرف سے کہا کہ:

مولانا! آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے جس کی طرف پہلے کبھی میرا ذہن منتقل نہیں ہوا تھا۔ (ص ۳۶۔ گنجہائے گراں مایہ از پروفیسر رشید احمد صدیقی مطبوعہ دہلی)

آپ کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

ان کی ساری عمر علی گڑھ میں گذری۔ کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ ان میں سے کسی سے دب کر یا جھک کر ملے۔ جس سے ملے برابری سے ملے اور اپنے عالمانہ وقار کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر۔ علی گڑھ کے سیاسی انقلابات کی آندھیاں بھی ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیں۔ علی گڑھ کے عشرت خانے میں ان کی قیام گاہ ایک درویش کی خانقاہ تھی۔ یہاں جو بھی آتا جھک کر آتا۔ (ص ۱۹۔ یاد رفتگاں از سید سلیمان ندوی)

مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے، کسی کے علم سے نہ کسی کی دولت سے نہ کسی کے اقتدار سے۔ مذہبی عقائد میں کٹر، سلوک میں بے لوث۔ جو جتنا چھوٹا ہوتا اس سے اتنی ہی فروتنی سے ملتے۔ بڑا

ہوتا تو اس سے کہیں بڑا ہو کر ملتے۔ علم کا وقار ان کے دم سے تھا۔ معزز و محبوب مولوی میں نے انھیں کو پایا۔ (ص ۳۴۔ گنجہائے گراں مایہ از پروفیسر رشید احمد صدیقی، مطبوعہ دہلی)

نواب مشتاق احمد خاں حیدر آبادی لکھتے ہیں:

وہ اپنی شخصیت، علم و فضل اور کردار کی وجہ سے علی گڑھ ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان میں بڑی عقیدت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ (ص ۹۴۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، شمارہ جون ۱۹۷۷ء)

(۱۰) مولانا معین الدین ٹونکی ثم اجمیری (متولد ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء۔ متوفی ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء)

شاگرد رشید مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی (متوفی ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) تلمیذ مولانا عبدالحق خیر آبادی (متوفی ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء) مدرسہ نعمانیہ لاہور میں ڈھائی سال تک صدر مدرس رہ کر ۱۳۲۶ھ میں اجمیر آئے اور ۱۳۲۷ھ میں مدرسہ معین الحق قائم کیا۔ نظام حیدر آباد دکن ایک سفر زیارت کے وقت آپ کے درس میں کئی بار شریک ہوئے اور متاثر ہو کر آپ کو خلعتِ شاہانہ سے نوازا۔

شیخ الاسلام مولانا انوار اللہ حیدر آبادی (متوفی ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۸ء) بانی جامعہ نظامیہ حیدر آباد کی تحریک پر مدرسہ معین الحق کا نام مدرسہ معینیہ عثمانیہ رکھا گیا اور نظام دکن کی جانب سے ساڑھے بارہ سو روپے سالانہ اس مدرسہ کا وظیفہ مقرر ہوا۔ یہاں مولانا معین الدین اجمیری پندرہ سال تک بحیثیت صدر المدرسین درس و تدریس میں مصروف رہے۔ ۱۳۳۷ھ میں کسی وجہ سے اس سے آپ نے علیحدگی اختیار کر لی اور ۱۳۳۸ھ میں اجمیر ہی کے اندر ایک دوسرا مدرسہ دارالعلوم حنفیہ قائم کر کے بارہ سال تک اس میں درس دیتے رہے۔ آپ کو دوبارہ مدرسہ معینیہ عثمانیہ میں لایا گیا مگر پھر ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء میں اس سے آپ الگ ہو گئے۔

مولانا معین الدین اجمیری نے کئی کتابیں لکھیں۔ بدمذہبی و گمراہی کے خلاف آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ملّی معاملات میں ہمیشہ سرگرم رہے اور کئی تحریکوں کی قیادت کی۔ اس راہ میں مصائب اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ صبر و قناعت، استقلال و استقامت اور استغنا و توکل آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ نوافل و مستحبات اور اوراد و وظائف کے ہمیشہ پابند رہے۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں یہ حدیث آئی ہے کہ حضور کے مرض وفات کی تکلیف دیکھ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بے اختیار

پکار اٹھیں۔ یا ابتاہ (اے میرے باپ) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! لاکرب علیٰ ابیك بعد الیوم۔ آج کے دن کے بعد تمہارے باپ پر مصیبت نہیں۔ تو اس جملہ پر حضرت مولانا بیتاب ہو جاتے۔ آنسو نکل آتے۔ چیخ نکل جاتی۔ بسا اوقات غشی طاری ہو جاتی۔ مدرسہ میں درس دیتے وقت ہر مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ (ماہنامہ معارف اعظم گڑھ۔ شمارہ اپریل ۱۹۴۰ء)

فرنگی محل لکھنؤ و خانوادۂ عزیزی دہلی اور سلسلۂ خیر آباد کے یہ وہ جلیل القدر علما و فضلائے مشاہیر ہیں جو اہل ہند کے لئے سرمایۂ اعزاز و افتخار ہیں اور جن کا دینی و علمی فیضان ہند و پاک کے گوشے گوشے میں جاری ہے۔

ملا قطب الدین شہید سہالوی (متوفی ۱۱۰۳ھ/ ۱۶۹۱ء) ملا دانیال شاگرد ملا عبد السلام اودھی اور قاضی گھاسی شاگرد شیخ محبّ اللہ الہ آبادی (متوفی ۱۶۴۸ء) کے شاگرد تھے جن کے صاحبزادۂ والا مرتبت ملا نظام الدین سہالوی بانی درس نظامی تھے۔ یہ ملا نظام الدین اپنے والد ملا قطب الدین کے علاوہ حافظ امان اللہ بنارسی (متوفی ۱۷۲۱ء) اور مولانا غلام نقشبند لکھنوی (متوفی ۱۷۱۴ء) کے مایۂ ناز شاگرد اور حضرت شاہ عبد الرزاق بانسوی کے حلقۂ بیعت و ارادت میں داخل تھے۔ ۱۷۴۸ء میں ملا نظام الدین سہالوی کا وصال ہوا۔

سید سلیمان لکھتے ہیں:

........اور ملا قطب الدین سہالوی کے صاحبزادہ ملا نظام الدین نے ملا امان اللہ بنارسی سے پڑھا۔ اور ملا نظام الدین کے وارث ملا بحر العلوم (علامہ عبد العلی فرنگی محلی) ہوئے۔

بحر العلوم سے خیر آباد کا علمی خاندان چلا۔ میر زاہد کا فیض شاہ عبد الرحیم صاحب دہلوی کو اور ان سے شاہ ولی اللہ صاحب کو، ان سے شاہ عبد العزیز صاحب کو پہنچا اور ان سے ملک میں عام ہوا۔ (ص ۶۰۴۔ رود کوثر مؤلفہ شیخ محمد اکرام۔ مطبوعہ ادبی دنیا، مٹیا محل دہلی)

اب اس تحریر کا اختتام ایک مقدس اور ایمان افروز دینی و علمی واقعہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جس کے راوی سلسلۂ خیر آباد کے دور آخر کے معروف عالم مولانا سید نجم الحسن رضوی خیر آبادی تلمیذ مولانا معین الدین اجمیری تلمیذ حکیم سید برکات احمد ٹونکی ہیں۔

"حضرت مولانا علی حسین خیر آبادی مہاجر مدنی علیہ الرحمہ نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا اعظم حسین خیر آبادی مہاجر مدنی علیہ الرحمہ سے سنی ہوئی ایک روایت راقم سطور کو ایک مکتوب میں

تحریر فرمائی۔ جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ عربی شاعری میں علامہ فضل حق خیرآبادی کس بلند مقام پر فائز تھے۔ اس مکتوب کا ضروری حصہ یہاں نقل کیا جارہا ہے۔

ایک بار آپ کے ایک محبّ جو کہ عازم حج و زیارت شریف تھے بغرض رخصت حاضر ہوئے۔ آپ ان کی تشیع کے لئے پیادہ پا ہوئے اور فرمایا کہ حاضریِ اقدس پر اس مہجور غلام کے چند ابیات عرض کردینا۔ اور اسی حال میں راستہ چلتے آپ نے برجستہ وہ اشعار لکھوادیے تھے جن کی تعداد دو قصیدوں کی صورت میں پچاس شعر کے قریب ہوگئی ہے۔

جس وقت ان زائر صاحب نے ان کو مواجہِ اشرف میں پڑھنا شروع کیا تو علما نے جو مشغول تدریس تھے اپنے اپنے درس بند کردیے اور حرم محترم میں ہر جانب سے خلقت ان کے گرد جمع ہوگئی اور حاضرین پر عجیب حال طاری رہا۔

علما نے سن کر فرمایا! یہ کلام تو کسی فصیح عربی الاصل کا بہ مشکل ہوسکتا ہے چہ جائے کہ کسی ہندی کا۔ اور بہتوں نے اس کے نقول لیے۔ (ص۔ج۔ تقدیم باغی ہندوستان بقلم سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی)

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وثنا کرتے ہوئے اپنے قصیدۂ ھمزیہ میں علامہ فضل حق خیرآبادی عرض کرتے ہیں:

هُوَ اولُ النورِ السَّنيِ تبلّجت ... بضيائهٖ في العالم الاَضواء

هو اولُ الاَنبياءِ اٰخِرُهم بهٖ ... خُتِم النبوةُ و ابتدا الاِبداء

بَدءٌ بهٖ ابدى المهيمنُ سِرّهٗ ... فَلِاَجلهٖ الِابداء و الِايداء

قد خَصّهٗ البارى باوصافٍ علىً ... لم يُعطها الاَحداثُ و القدماء

اعطاه فضلاً ليس يمكن ان يكو ... نَ لهٗ شريك فيهِ او شُركاء

اَسماه اِذ اَسماه بِالحسنىٰ فَمِنْ ... اسماءِ خالقهٖ لهٗ اَسماء

بَرٌّ رحيمٌ مِفضلٌ ذو قوةٍ ... هادٍ رؤفٌ مُحسِنٌ مِعطاءٍ

قد زاد مكةَ رفعةً ميلادُهٗ ... و تشرفت بوجودهٖ البطحاء

قد طاب طيبةُ اذ ثواها و اعتلت ... شَرَفاً يُيَمّمُ ساحَها البُعداء

بشرٌ بشيرٌ بَشّرتْ زُبرٌ بهٖ ... مِن قبلهٖ اَنبا بهٖ الاَنبياء

اَنبا ببعثتهٖ المسيحُ و قبلهٗ

موسىٰ كما انبا بهٖ شعياء

تعارفِ تصانیف

سید نجم الحسن رضوی خیر آبادی

حاشیۂ علامہ فضل حق خیر آبادی بر شرح سُلّم قاضی مبارک

قاضی مبارک گوپاموی کی شرح سُلّم کو درسیات میں جو بلند مقام حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب درس نظامی کے منتہی طلبہ کو پڑھائی جاتی ہے۔ یہ کتاب علما وفضلا کی توجہ کا ہمیشہ مرکز رہی ہے۔ اس پر مختلف تعلیقات، شروح اور حواشی لکھے گئے ہیں جن میں ماہرین معقولات نے اپنی طباعی کے جوہر دکھائے ہیں اور اپنے فن کے کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔

سلّم العلوم کی مشہور و متداول شروح یہ ہیں۔ (۱) شرح قاضی مبارک گوپاموی (متوفی ۱۱۶۴ھ) (۲) شرح ملا احمد عبدالحق فرنگی محلی (متوفی ۱۱۶۷ھ) (۳) شرح ملا مسافر (متوفی) (۴) شرح حمداللہ سندیلوی (متوفی ۱۱۶۰ھ) (۵) شرح ملا مبین (متوفی ۱۲۲۵ھ) (۶) شرح ملا حسن فرنگی محلی (متوفی ۱۲۰۹ھ)

ان میں قاضی مبارک کی شرح سب میں ممتاز و اہم ہے جس کا حاشیہ لکھ کر علامہ فضل حق خیر آبادی کے قلم نے تحقیق و تدقیق کی جوگلکاری اور فن کے اسرار و رموز کے جن نقوش کی آرائش و زیبائش کی ہے اس سے اس حاشیہ کا دنیاے معقولات میں درجہ بہت بلند ہوگیا ہے۔ اور اساطین فن نے اس کارنامے پر علامہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔

علامہ کا یہ حاشیہ صرف کتاب کے غوامض کا حل نہیں ہے بلکہ معقولات کا ایک دائرۃ المعارف

ہے جس میں فن کے تمام اہم مسائل پر بصیرت افروز محققانہ اور مجتہدانہ تبصرہ ہے۔ بعض ارباب علم نے تو اس کو معقولات کا فتاویٰ کہا ہے۔ یہ علامہ کی شاہکار تصنیف ہے جس پر خود علامہ کو ناز تھا۔

جزیرۂ انڈمان کی حراست کے زمانہ میں کسی نے دریافت کیا تھا کہ مولانا آپ ہندوستان میں کیا یادگار چھوڑ آئے ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا کہ دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک فرزند عبدالحق ہیں اور دوسری یادگار قاضی کا حاشیہ۔

اس حاشیہ میں علامہ کے ذہنِ ثاقب نے فن کے جن حقائق سے بحث کی ہے دوسرے اصحاب شروح و حواشی ان بلندیوں تک پہونچنے سے قاصر رہے ہیں۔

یہ حاشیہ پہلی بار ۱۳۱۷ھ میں مطبع مصلح المطابع دہلی میں طبع ہوا تھا جسے قدردانوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد نایاب ہوگیا۔

مالک مطبع خواجہ مصلح الدین جو علامہ کی قدر و منزلت سے پوری طرح آگاہ تھے انھوں نے کتاب کے آخر میں اس حاشیہ کا جو گراں قدر تعارف کرایا ہے اس سے فن معقول میں علامہ کی حذاقت اور عبقریت پر پوری طرح روشنی پڑتی ہے۔ خواجہ صاحب نے علامہ کو علومِ حکمیہ کا بحرِ زخار کہا ہے جس کی شان یہ ہے کہ من شرب قطرة منه صار بحراً، لاساحل له۔ سب سے پہلے انھوں نے دوسرے علما کے حواشی اور شروح کی حیثیت اور ان کے مقام علمی کے سلسلہ میں لکھا ہے:

> و كثير من العلماء قدعلّقوا عليه التعليقات و الحواشي لتزيل عنه الغواشي فلم تغن عن كشفه شيئا۔

اس کے بعد امام المعقولات علامہ فضل حق کے حاشیہ کی علمی قدر و منزلت اور اس کے مقام کا تعین کیا ہے:

> اِلا التعليقات للفاضل المشهور بالمنطق و العلوم العقلية بين الجمهور، المعروف من الغرب الى الشرق المولوى محمد فضل حق الخيرآبادى عامله الله بكرمه المتمادى يوم يناد المنادى الذى هو بحرالمنطق و العلوم الحكمية من شرب قطرة منه فقد صار بحراً، لاساحل له و شيخاً لامخاصم له و مرجعا ينجذب اليه كل استاذ لامانع له.

فان كنت فى شك مما اقول فمن مؤلفاته التعليقات المعلقة علىٰ شرح السلّم للقاضى مبارك تشهد علىٰ قولى بلا فضول فان مايشهد و يدل علىٰ حال الفاعل حال المفعول فانظر الىٰ هذه الحواشى و التعليقات ليظهر لك مافيها من غرائب التوضيحات و التحقيقات و ابين لك شيئا مما فيها علىٰ الاجمال۔

اس کے بعد خواجہ صاحب نے وہ خصوصیات ذکر کی ہیں جن کی وجہ سے اس حاشیہ کو برتری حاصل ہے۔اس کا اردو میں خلاصہ درج ذیل ہے۔

(۱) شرح سلم قاضی میں جن معانی میں خفا باقی رہ گیا تھا علامہ کی تعلیقات میں ان کو ظاہر کردیا گیا اور الفاظ و بیان کے اشکال کو دور کردیا گیا۔جن مسائل کا کتاب میں بیان تھا ان کو دلائل سے آفتاب کی طرح روشن کردیا گیا۔

(۲) علامہ نے مسائل کی ایسی تنقیح فرمائی جس سے زیادہ ممکن نہیں اور ان کو اس طرح واضح فرمایا کہ اس سے زیادہ وضاحت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

(۳) اس حاشیہ میں علامہ نے منطق کے مشکل مسائل کی تحقیق کی ہے اور دقیق مباحث کو سہل انداز میں پیش فرمایا ہے۔

(۴) منطق کی درسی کتابوں کے دشوار مسائل کی پوری تنقیح فرمادی ہے۔

(۵) مختلف فیہ مسائل میں جو حق مسلک تھا اس کو محکم اور قطعی دلائل سے اس طرح ثابت کردیا ہے کہ ذہین وغبی و ناقص مبتدی اور ماہر منتہی سب پر یکساں اس کی حقانیت واضح ہوگئی۔

(۶) جو منطق دانی کے مدعی ہیں حالاں کہ وہ حقیقت میں اس سے بے بہرہ ہیں، اس حاشیہ کے دیکھنے کے بعد ان کو بھی اپنے بے مائیگی کا اعتراف ہوجائے گا اور وہ محسوس کریں گے کہ واقعی منطق وہ ہے جو اس حاشیہ کے مضامین میں ہے۔اور یہ حاشیہ تمام کتابوں کا مغز ہے۔

(۷) طباعت سے قبل یہ حاشیہ جس کے پاس تھا وہ انتہائی اِخفاء سے کام لیتا تھا خواہ طالب دید کتنے ہی حیلے کرتا (مگر اس کو زیارت نصیب نہ ہوتی تھی)

اُمّہاتِ مسائل

مندرجہ ذیل پانچ مسائل، فن کے امہات مسائل میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور عہد قدیم سے ان کے بارے میں حکما کے درمیان اختلاف ونزاع کا ایک طویل سلسلہ چلا آرہا ہے۔

(مسائل خمسہ) علم، وجود، جعل، کلی طبعی اور تشکیک کے بارے میں فضلائے دہر نے مستقل رسالے تصنیف کیے۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ جس کے فضل وکمال کا ہند اور بیرون ہند میں ڈنکا بج رہا تھا وہ ان مباحث کو تشنہ چھوڑ دیتا۔ خاتم المحققین فاضل خیر آبادی کا قلم حقیقت رقم حرکت میں آیا اور انھوں نے ان مباحث پر سیر حاصل بحث کر کے تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ جس سے اربابِ دانش اور اصحابِ فکر ہمیشہ اپنی تشنہ لبی دور کرتے رہیں گے۔

مسئلۂ وجود

یہ فن کا بہت ہی اہم مسئلہ ہے۔ وجود کے دو معنی ہیں۔ وجود بمعنی مصدری (چیز کا موجود ہونا۔ پایا جانا)۔ چوں کہ یہ انتزاعی امر ہے جو چیز کے موجود ہونے کے بعد اس سے منتزع ہوتا ہے اس لئے اس کی عینیت یا زیادت محل اختلاف نہیں۔

(۲) وجود مابہ الموجودیہ جس کو وجود حقیقی کہتے ہیں اور اس کا نام وجود خاص بھی ہے۔ معرکہ آرائی اس کے بارے میں ہے کہ وہ ماہیت کا عین ہے یا زائد؟ اس کے بارے میں متکلمین کا نظریہ یہ ہے کہ وہ تمام حقائق میں زائد ہے۔ خواہ حقیقۃً واجبہ ہو یا ممکنہ کسی کا عین نہیں ہے۔ حکمائے مشائیہ وجود کی دو مختلف حقیقتیں مانتے ہیں۔ ایک حقیقت واجبہ۔ دوسری حقیقۃ ممکنہ۔ واجب میں ان کے نزدیک وجود عین ذات ہے۔ واجب کے علاوہ تمام ممکنات میں وجود زائد ہے۔

اَشاعرہ کے نزدیک وجود ایک حقیقت نہیں ہے بلکہ مختلف حقیقتوں کا نام ہے۔ ہر حقیقت کا وجود اس کا عین ہے۔

اِشراقیہ کے نزدیک وجود ایک حقیقت ہے جو واجب اور ممکن دونوں میں مشترک ہے۔ ان کے نظریہ کے مطابق عالمِ کون میں صرف ایک حقیقت موجود ہے جس کا فرد اکمل واجب تعالیٰ

اور فرد ناقص ممکن ہے۔

میر زاہد اور صوفیاے کرام وجود کلی نہیں بلکہ شخصی مانتے ہیں۔ لہذا یہاں اشتراک یا عدم اشتراک کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان کے نزدیک مظاہر اور متعلقات کے لحاظ سے تعدد آیا ہے۔

میر زاہد اور صوفیاے کرام کے مذہب میں فرق یہ ہے کہ صوفیاے کرام وجود کے علاوہ کسی دوسری ذات کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک عالمِ کون میں محض وجود جلوہ گر ہے جو نام ہے واجب تعالیٰ شانہ کا۔ ممکنات تو اس کے ظلال ہیں۔ ان کی کوئی مستقل ذات نہیں۔

میر زاہد کے نزدیک ممکنات گو مستقل وجود رکھتے ہیں لیکن بذات خود وجود سے خالی ہیں۔ البتہ جب ان پر وجود واجب کا پرتو اور عکس پڑتا ہے تو وہ موجود کہلانے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ جیسے شمس کا پرتو پڑنے سے پانی کو شمس کہہ دیتے ہیں۔ (از افادات علامہ معین الدین اجمیری)

اصل واقعہ یہ ہے کہ وجود کی عینیت اور زیادت پر فن کے دوسرے مسائل کی بنیاد ہے۔ اگر وجود کو عین مانا جائے تو جعل بسیط اور تشکیک فی الماہیت کی حقانیت ثابت ہوتی ہے اور کلی طبعی کا وجود بھی خارج میں ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ جب اشیا کے وجودات اور تشخصات ماہیات کے عین ہیں۔ اور ماہیات خارج میں موجود ہیں تو اس مسلک پر مابہ الاشتراک اور مابہ الامتیاز ایک ہے۔ وہی ماہیت کلیہ تمام وجودات اور تشخصات کا سرچشمہ ہے۔ محققین نے یہی مسلک اختیار کیا ہے اور حضرت ملا نظام الدین اور ان کے کل تلامذہ کا اسی طرف میلان ہے۔ (افادات مولانا اجمیری)

وجود کی عینیت پر مسئلہ حصول الاشیا باشباحها متفرع ہے۔ اور وجود کی زیادتی پر حصول الاشیاء بانفسها۔ اشراقیہ پہلے قول کے اور مشائیہ دوسرے کے قائل ہیں۔

علامہ فضل حق خیر آبادی نے واجب اور ممکن دونوں میں عینیت وجود کے مسلک کو حق بتلایا ہے۔ حاشیۂ قاضی میں رقمطراز ہیں:

> و تحقیق المقام علیٰ وجه یمیط غواشی الاوهام ان الوجود یمکن ان یراد به معنیان۔ الاول المعنی المصدری و الثانی منشأ انتزاعه۔ الاول لیس عینا لشیءٍ من الحقائق اصلًا و الثانی عین الواجب فقط علی رأی الحکماء و عین الممکن ایضاً علیٰ مذهب اهل الحق۔

(حاشیۂ قاضی۔ص ٦١)

وجود کی عینیت پر جو مسائل متفرع ہیں ان سب پر بھی علامہ نے محققانہ بحث کی ہے۔

مسئلۂ علم

اس کا شمار بھی فن کے معرکۃ الآرا مسائل میں ہے۔اس مسئلہ کے مختلف عنوان ہیں۔اور ہر عنوان خود ایک مستقل مسئلہ ہے۔حاشیۂ قاضی میں علامہ فضل حق نے علم کی بحث میں درج ذیل عنوانات پر مجتہدانہ تبصرہ فرمایا ہے۔

(۱) تصور اور تصدیق کا مقسم۔علم حصولی حادث ہے یا مطلق حصولی؟

(۲) حضوری اور حصولی کی جانب علم کی تقسیم۔

(۳) حصول الاشیاء بانفسہا وباشباحہا کی تحقیق۔

(۴) مورد قسمت الشئ المطلق ہے یا مطلق الشئ ،اس کی تحقیق۔

(۵) علم کی کنہ بدیہی ہے یا نظری؟

(۶) علم کے بارے میں تیرہ مذاہب ہیں۔یہ بہت نفیس بحث ہے۔

اس بحث کا آغاز علامہ نے اس طرح کیا ہے:

اعلم انهم اختلفوا فى العلم اختلافاً عظيماً فلنقص عليك حاله فنقول المذاهب التى بلغتنى ثلثة عشر۔

اس بحث کو علامہ نے بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

(۷) علم کو صورت قرار دینے کا بطلان (یہ بحث بھی اس موضوع پر لاجواب ہے)

(۸) معلوم کے بارے میں اختلاف۔اس میں علامہ نے بارہ مذاہب بتلائے ہیں۔

(۹) حصول الاشیاء بانفسہا پر اعتراضات وجوابات۔

(۱۰) مسئلہ وجود ذہنی پر اعتراضات اور جوابات۔

(۱۱) علما کی اس بارے میں تصریح کہ علم حالت کا نام ہے۔

(۱۲) علم حصولی قدیم اور علم حضوری بدیہی اور نظری نہیں ہوتے۔

(۱۳) بدیہی اور نظری ہونا علم کی صفت ہے یا معلوم کی؟

(۱۴) واجب تعالیٰ کے علم فعلی کی بحث۔

(۱۵) واجب تعالیٰ کے لئے علم حضوری کا اِثبات۔

(۱۶) واجب تعالیٰ کے علم فعلی میں افلاطون کا مسلک۔

(۱۷) اِثبات علم واجب تعالیٰ میں مسالک۔

(۱۸) فارابی کے اس قول کی تحقیق کہ "العلم بالکل بعد ذاته"

خاتم المحققین علامہ خیر آبادی کا حاشیہ' قاضی تحقیقات کا گنجینہ ہے جس کا ہر صفحہ علمی حقائق سے مرصع اور ''جام جہاں نماست ہر صفحہ دریں'' کا مصداق ہے۔

مذکورہ مباحث کے علاوہ مندرجہ ذیل مسائل پر بھی علامہ نے محققانہ تبصرہ فرمایا ہے۔

(۱) تحقیق لفظ سُبحٰن۔ اور اس کے استعمال کے محل۔

(۲) اجزاء حدیہ اور غیر حدیہ کی بحث۔

(۳) باری تعالیٰ کی بساطت کا ثبوت۔

(۴) کُنہ واجب تعالیٰ کا علم۔

(۵) اِبطال تماثل واجب تعالیٰ کے لئے۔

(۶) واجب تعالیٰ کے لئے اِبطال تجانس۔

(۷) ابن کمونہ کا توحید پر شبہ اور اس کا رد۔

(۸) واجب تعالیٰ کی صفات کی تحقیق۔

(۹) واجب سبحٰنہ کی جسمانیۃ کا اِبطال۔

(۱۰) مبحث جعل

(۱۱) وجود کے بارے میں مذاہب کا بیان۔

(۱۲) میر باقر کے اس نظریہ کا ابطال کہ "مصداق الوجود فی الماهیات الممکنة نفس الماهیة من حیث الاستناد الی الجاعل۔"

(۱۳) تحقیق معنی مصداق

(۱۴) وجود کے بارے میں حکما اور متکلمین کا اختلاف۔

(۱۵) متکلمین کے اس مسلک کی تحقیق کہ وجود ذات سُبحنہ کے لئے زائد اور اس کا معلول ہے۔

(۱۶) باری تعالیٰ کے لئے موجودیۃ کے اِطلاق پر حکما کا اختلاف (یہ نفیس بحث ہے)

(۱۷) اس بات کی تحقیق کہ جاعل کی طرف احتیاج کی علت امکان ہے یا حدوث؟

(۱۸) ممکن کے ایجاد پر قادر نہ ہونے کا استدلال۔

(۱۹) جعل کے بارے میں نزاع۔

(۲۰) اصحاب جعل بسیط اور مؤلف کے درمیان مدارِ اختلاف (وجود کی عینیت وزیادت میں)

(۲۱) ذاتیات کا حمل مجعول ہے یا نہیں؟

(۲۲) نسبت کا خارج میں عدم وجود۔

(۲۳) اصحاب جعل مؤلف کے شبہات اور ان کا رد۔

(۲۴) بخت واتفاق کے معنی کی تحقیق۔

(۲۵) بحث مقدمۂ علم ومقدمۂ کتاب۔

(۲۶) بحث متعلق تصدیق۔

(۲۷) "التصور و التصديق نوعان متباينان من الادراك" کا بیان۔

(۲۸) وجود ذہنی پر اشکال اور اس کے جوابات۔

(۲۹) معنی نظری وبدیہی کی تصدیق۔

(۳۰) بیان برہان تضعیف وتضایف۔

(۳۱) برہان تطبیق کا بیان۔

(۳۲) العدد عرض

(۳۳) اكتساب التصور من التصديق کا بیان۔

(۳۴) تحقیق معنی فکر وحدث۔

(۳۵) المعرف يفيد علما جديدا ام هو آلة لملاحظة المعرف۔

(۳۶) تحقیق معنی موضوع واعراض ذاتیہ۔

(۳۷) بیان تقسیم واسطہ۔

(۳۸) عرضی وذاتی کی تقسیم۔

(۳۹) معقول ثانی کی تحقیق (بہت ہی کارآمد اور مفید ہے)

(۴۰) کلیۃ، جزئیۃ، ذاتیۃ، عرضیۃ، وجوداور لوازم ماہیت کا شمار معقولات ثانیہ میں ہے یا نہیں؟

(۴۱) معقولات ثانیہ سے مقصود قضایا ذہنی ہیں یا خارجی یا حقیقی؟ قضیہ ذہنیہ وخارجیہ و حقیقیہ کی تقسیم کا بیان۔

(۴۲) ظرف اتصاف کی تحقیق (بہت تفصیلی اور نافع بحث ہے)

(۴۳) بحث قیام الوجود بالماهیة من حیث هی هی۔

(۴۴) تحقیق ظرف الاتصاف بالوجوب۔

(۴۵) تحقیق ظرف الاتصاف بالامکان۔

(۴۶) تحقیق الحیثیة المعتبره فی الموضوع۔

(۴۷) تحقیق موضوع المنطق ماهو۔

(۴۸) بحث معقولات ثانیہ یا معلوم تصوری وتصدیقی۔

(۴۹) بحث امہات المطالب۔

(۵۰) اس بات کا بیان کہ "ما" حداور جنس اور نوع میں منحصر ہے۔

(۵۱) تقسیم هل اور تثلیث قسمة هل۔

(۵۲) بحث "التقرر مقدم علی الوجود"

(۵۳) تعریف هلیة بسیطه و مرکبه۔

(۵۴) تحقیق قضیہ "زید معدومٌ۔"

(۵۵) بیان ان النسبة السلبیة ربط او سلب ربط۔

(۵۶) بحث ان فی الهلیة البسیطه نسبة رابطة ام لا۔

(۵۷) بیان ان فی القضیة نسبة اخریٰ سوی النسبة التامة الخبریة۔

(۵۸) بیان ان فی الهلیة المرکبة نسبة اخریٰ۔

(۵۹) اختلاف محقق الدوانی مع معاصره الصدر فی الحمل الاولیٰ۔

(۶۰) تحقیق تعداد اجزاء قضیہ۔

عنوانات مذکورہ پر نظر ڈالنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس حاشیہ میں فن کے تمام اہم مسائل کو زیر بحث لاکر ان پر محققانہ رائے قائم کی گئی ہے۔ اس لئے اس کو فن معقول کا دائرۃ

المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کہنا غیر مناسب نہ ہوگا۔

کچھ عرصہ ہوا جب پاکستان میں اس (حاشیہ سلّم قاضی مبارک) کا دوسرا ایڈیشن فوٹو آفسٹ پر شائع ہوگیا ہے جو مکتبہ قادریہ اندرون لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتا ہے۔

الهدية السعيدية

علامہ فضل حق خیرآبادی کی یہ تصنیف برصغیر کی تمام عربی درسگاہوں کے نصاب میں داخل ہے۔ اس کتاب کی تالیف کا آغاز اس طرح ہوا کہ علامہ اپنے شہرۂ آفاق فرزند مولانا عبدالحق خیرآبادی کی تدریس کے لئے اسباق تحریر فرمادیتے تھے۔ جب متعدبہ حصہ ہوگیا تو تلامذہ نے استدعا کی کہ مباحث کے اضافہ کے بعد ان کو مکمل کتاب کی حیثیت دے دی جائے۔ علامہ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اپنے شبدیزِ قلم کو رواں کردیا۔

اس کتاب میں اِبطال اجزاءلاتجزی، اثبات ہیولیٰ، بحثِ زمان ومکان کو بہت وضاحت کے ساتھ سہل انداز میں بیان فرمایا ہے۔ اور دوسرے مایعم الاجسام کے مسائل کی بھی خوب توضیح فرمائی ہے۔ عنصریات کی بحث بڑے بسط و تفصیل سے لکھی ہے۔

کتب درسیہ میں اس تفصیل اور وضاحت کو اگر ہدیہ سعیدیہ کا مخصوص حصہ سمجھا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اپنی تحقیق کے مطابق حرکتِ ارض کے ابطال پر دلائل کے انبار لگادیئے ہیں۔

علامہ فضل حق خیرآبادی نے یہ کتاب بہت عجلت کے عالم میں لکھی ہے۔ مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے:

"و بعد فهذه جملة جميلة فى الحكمة الطبعية يزرى بزهوها. بانوار الربيعة نطقت بها ارتجالا و نمقتها استعجالا۔"

عجلت میں لکھی جانے کے باوجود یہ کتاب معقولات کے مبتدی طلبہ کے لئے شافی وکافی ہے۔ اگر حکمۃ طبعیہ میں ہدیہ سعیدیہ اور الٰہیات میں مولانا عبدالحق خیرآبادی کی الجواہر الغالیہ طلبہ کے درس میں داخل کردی جائیں تو فلسفہ کی استعداد بدرجہ اتم پیدا ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد اعلیٰ کتابیں وہ پوری بصیرت کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ ہدیہ سعیدیہ میں نفس کی بحث میں کچھ

حصہ ناقص رہ گیا تھا۔

علامہ نے الخاتمۃ فی المباحث کے سلسلہ میں جو بیان کے عنوان قائم کیے ہیں وہ یہ ہیں:

البحث الاول ان النفس مغایره للمزاج۔ البحث الثانی ان النفس مغایرة للبدن۔ البحث الثالث ان النفس الناطقة مجردة عن المادة، المبحث الرابع فی النفس الناطقة هل هی حادثة او قديمة۔ المبحث الخامس فی اتحاد النفوس بالماهية و اختلافها۔

المبحث الخامس بھی ناتمام رہ گیا تھا۔اور اس کے بعد کی پانچ اور بحثیں نہ لکھی جا سکی تھیں جن کی تکمیل مولانا عبداللہ بلگرامی کی فرمائش پر علامہ کے فرزند مولانا عبدالحق خیر آبادی نے کی جو بطورِ تتمہ کتاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ مبحث سادس عقیدۂ تناسخ کے رد میں ہے۔ مبحث سابع میں النفس تبقی بعد خراب البدن و لاتفنی کا بیان ہے۔ مبحث ثامن میں النفس مدركة للكليات و الجزئيات ام هی مدركة للكليات کا بیان ہے۔ مبحث تاسع میں کیفیت تعلق النفس بالبدن سے بحث کی گئی ہے۔ مبحث عاشر میں مراتب نفس انسانی فی الادراكات کی تفصیل کی گئی ہے۔

یہ کتاب علامہ عبداللہ بلگرامی کے تحشیہ التحفۃ العلیہ کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔ آخر میں بطور ضمیمہ مولانا سلطان حسن بریلوی کا وہ رسالہ شامل کر دیا گیا ہے جس میں انھوں نے مفتی سعداللہ صاحب کے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو انھوں نے ہدیہ سعیدیہ کی بعض عبارتوں پر کیے تھے۔ یہ کتاب ہندوستان میں برابر طبع ہوتی رہتی ہے۔ اور پاکستان میں بھی طبع ہوئی ہے۔ نصف صدی قبل یہ جامع ازہر مصر کے نصاب میں بھی داخل تھی۔ اسی زمانہ میں اس کا مصری ایڈیشن بھی شائع ہوا تھا۔

الروض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود

علامہ فضل حق خیر آبادی نے یہ رسالہ وحدۃ الوجود کے اثبات میں تحریر فرمایا ہے۔ مسئلہ وحدۃ الوجود صوفیاے کرام کے درمیان مدت سے ما بہ النزاع چلا آ رہا ہے۔ اس کا تعلق درحقیقت کشف وحال سے ہے نہ کہ قیل وقال سے۔ لیکن علامہ نے اپنی سحر نگاری سے حال کو قال کے قالب میں

بدل دیا ہے۔ قلم کی روانی اور فکر کی جولانی نے تحقیق میں جان ڈال دی ہے۔

استاذ محترم مولانا حکیم احمد علی صاحب خیرآبادی بیان فرماتے تھے کہ علامہ کا دوران سفر میں ایک بار بریلی میں گذر ہوا۔ وہاں کے اہل علم نے علامہ کی آمد کو غنیمت سمجھتے ہوئے مسئلہ وحدۃ الوجود پر سوالات اور اعتراضات کا طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کے جواب میں موصوف نے فرمایا کہ جہاں تک دلائل و براہین کا تعلق ہے وہ میں آپ کے سامنے پیش کیے دیتا ہوں۔ اس کے بعد تسلیم کرنا یا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔

پھر علامہ نے اس موضوع پر ایسی جامع اور مدلل تقریر فرمائی کہ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ علامہ اقبالؔ کے کلام کے مشہور شارح اور مبصر پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے لکھا ہے کہ علامہ خیرآبادی کے دلائل دیکھ کر میں وحدۃ الوجود کا قائل ہو گیا ہوں۔

یہ کتاب بھی علامہ نے بہت عجلت میں لکھی ہے۔ فرمایا ہے:

"و سمیتها بالروض المجود املیتها مرتجلًا من دون بذل المجهود فی تحقیق ما علیه ائمة الکشف و الشهود۔

(الروض المجود)

یہ کتاب پہلی بار ۱۳۱۲ھ میں مطبع مفید الاسلام حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل دوبارہ ہندوستان میں مولانا سید غلام جیلانی کے مکتبۂ سمنانی (جس کا دفتر پہلے میرٹھ میں تھا) کے زیر اہتمام اس کی طباعت وجود پذیر ہوئی ہے۔

پاکستان میں مولانا حکیم محمود احمد برکاتی (کراچی) کے فاضلانہ اردو تراجم کے ساتھ مکتبہ قادریہ اندرون لوہاری دروازہ لاہور میں شائع ہوئی ہے جس میں مولانا عبدالحکیم شرف قادری نے عربی زبان میں علامہ کا تعارف بھی کرایا ہے۔

رسالہ کلی طبعی

کلی طبعی کی بحث معقولات کے امہات مسائل میں شمار کی جاتی ہے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی نے اس پر مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے۔ جس کی ضخامت کاپی سائز پر باریک قلم سے پچیس صفحات ہے۔ علامہ فن معقول کے بحر ناپیدا ر تھے۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا تحقیق کے دریا

بہا دیئے ہیں۔ رسالہ کلی طبعی میں بھی یہی شان نظر آتی ہے۔ رسالہ کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔

"اعلم انه قد استمر الخلاف بین الاسلاف و الاخلاف من الحکماء فی امر الکلی الطبعی فذهب الجمهور الیٰ ان الکلیات التی هی الانواع او ذاتیات للموجودات الخارجیة کالانسان و الحیوان و اللون و البیاض موجودات فی الخارج بالذات بعین وجودات افرادها و الکلیات التی هی عرضیات صادقة علی الموجودات الخارجیة کالکاتب و الماشی موجودة بوجود مایصدق هی علیه بالعرض۔"

یہ رسالہ اب تک طبع نہیں ہوا ہے۔

امتناعُ النظیر

علامہ فضل حق خیرآبادی نے یہ کتاب بزبان فارسی مولوی حیدر علی رام پوری کے اقوال کی تردید میں تحریر فرمائی ہے۔ اس کتاب کے سرِ ورق کا عنوان ہے رسالہ امتناع النظیر (صلی اللہ علیہ وسلم) لفضل حق الخیرآبادی علیه رحمة الباری۔ فی تردید اقوال: مولوی حیدرعلی رام پوری۔ مولداً والٹونکی مسکنا۔

بتحشیة و تصحیح: رأس المحدثین ورئیس المتکلمین مولانا سید شاہ سلیمان اشرف صاحب القادری الچشتی۔

فاضل خیرآبادی نے اس کتاب میں یہ ثابت کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مثل ونظیر ممتنع بالذات ہے۔ تحت قدرت داخل نہیں ہے۔

افاد استاذنا العلام حالا دعویٰ میکنم کہ شخصے کہ برابر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم در کمالات باشد ممتنع بالذات است و ہر چہ ممتنع بالذات است تحت قدرت الٰہی داخل نیست۔ (امتناع النظیر۔ ص۲)

اپنے اس قول کی تائید میں شرح مواقف اور شرح عقائد عضدیہ کی درج ذیل عبارت نقل فرمائی ہے:

"قال فی شرح المواقف المصحح للمقدورية هو الامكان لان الوجوب و الامتناع الذاتيين يحيلان المقدورية۔ و فی موضع آخر منه علمه تعالیٰ يعم المفهومات كلها الممكنة والواجبة و المتنعة فهوا عم من القدرة لانها تختص بالممكنات دون الواجبات و الممتنعات۔ و فی شرح العقائد العضدية المصحح للمقدورية هوالامكان۔ (امتناع۔ ص ۳)

علما فرماتے ہیں کہ اگر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی مساوی (نظیر) تسلیم کیا جائے تو وہ تمام صفات میں آپ کے برابر ہوگا جس میں صفت خاتم النبین بھی ہے تو اس ختم نبوت کے عقیدہ پر ضرب پڑتی ہے جو صراحۃً کفر ہے۔

امتناع النظیر کے ص ۱۵ پر اس کی خوب وضاحت کی ہے۔ اور اس کی دلیل نقلی سے توثیق فرمائی ہے:

"واز حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کہ مسلم روایت کردہ۔ ودراں ارشاد شدہ است: ارسلت الی الخلق عامة و ختم بی النبیون۔

نیز امتناع ذاتی مساوی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم در نعوت کمال ثابت است۔ چہ بر تقدیر امکان مساوی وفرض وجود آں یا ہر دو صفت دراں یافتہ شوند یا نہ؟ اگر یافتہ نشوند آں مساوی مساوی نشد و اگر یافتہ شوند آں مساوی مرسل الی الخلق کافہ باشد پس آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم از امت او باشد پس آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مساوی او نباشد۔

ونیز بر تقدیر ایں کہ آں مساوی آخرین ہمہ انبیا باشد تا معنی ختم بہ النبیون در آں یافتہ شود۔ بریں تقدیر ضرورت است کہ در آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفت ختم بہ النبیون کہ ارشاد شدہ است یافتہ

نشود۔ پس آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مساوی او نشد ند پس او مساوی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نشد۔

بہر کیف وجود مساوی مستلزم عدم آنست وہر چہ وجودش مستلزم عدم آں است محال بالذات است۔

علامہ خیر آبادی نے اس کتاب میں ضمناً صفات باری تعالیٰ سے بھی بحث کی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

اکنوں باید دانست کہ در مسئلہ صفات کمالیہ حضرت واجب الوجود سبحنہ اختلاف است۔ معتزلہ وفلاسفہ وحضرات صوفیاے کرام ومحققین ومتکلمین صفات کمالیہ را عین ذات می دانند وعامہ متکلمین صفات کمالیہ را غیر ذات حقہ اعتقادی کنند وعامہ اشاعرہ می گویند صفات او سبحنہ، نہ عین اویند نہ غیر اویند۔ وحال ایں مسئلہ آنست کہ در شرح عقائد جلالی می گویند۔ اعلم ان مسئلہ زیادۃ الصفات و عدم زیادتھا لیست من الاصول التی یتعلق بھا تکفیر احدالطرفین و قد سمعت بعض الاصفیاء انہ قال عندی ان زیادہ الصفات و عدم زیادتھا مما لایدرک بالکشف و من اسندہ الی الکشف فانہ ترا آی لہ ماکان غالبا علی اعتقادہ بحسب الفکر النظری و لا اریٰ باسا فی اعتقاد احد طرفی النفی و الاثبات فی ھذہٖ المسئلہ۔ انتہٰی۔ (امتناع۔ص ۶۸۔۶۹)

اس کے بعد علامہ نے تفصیل سے اس مسئلہ کو رقم فرمایا ہے۔ آخر میں اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر فرمائی ہے:

”وحق دریں مسئلہ ایں ست کہ مصداق صفات کمالیہ نفس ذات حقہ است۔ بلا زیادہ امر ماعلیہا و مفاہیم انتزاعیہ صفات عین ذات حقہ نیستند۔ (امتناع۔ص ۷۰)

اس کے بعد اشاعرہ کے مسلک کی مختلف شقوں پر بحث کی ہے۔

مولانا سید سلیمان اشرف صاحب (علی گڑھی) کو مدت دراز سے اس کتاب کے دیکھنے کی

تمنا تھی۔ بالآخر ان کو یہ نسخہ اپنے استاذ حضرت العلامہ ہدایت اللہ خاں صاحب (جون پوری) سے حاصل ہوا۔ یہ مسودہ خود مصنف کتاب علامہ خیر آبادی کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ استاذ محترم نے ان کو اس کی طباعت کی بھی اجازت دے دی۔ اس کے بعد موصوف نے استاذ العلماء مولانا برکات احمد ٹونکی اور مولانا عبدالمقتدر بدایونی کے نسخوں سے مقابلہ کرکے دوسرے فضلائے عصر کی تصحیح، اور اپنی شب و روز سہ سالہ کاوش و تصحیح کے بعد ایک خطیر رقم صرف کرکے اس کی طباعت و اشاعت کا فرض انجام دیا۔ اس کتاب میں مفید حاشیہ کے ساتھ قصیدہ کا حل لغات بھی موجود ہے۔ ۲۰ راگست ۱۹۰۸ء کو جادو پریس جون پور میں اس کی طباعت عمل میں آئی۔ عرصہ دراز سے یہ بالکل نایاب ہے۔ مکتبہ قادریہ لاہور کے زیر غور اس کی دوبارہ اشاعت ہے۔ (مرکز تحقیقات اسلامیہ، شادمان، لاہور سے رمضان ۱۴۲۰ھ/ دسمبر ۱۹۹۹ء میں اس کی طبع ثانی ہو چکی ہے)

تحقیق الفتویٰ فی اِبطال الطغویٰ

یہ کتاب بھی علامہ فضل حق کی مشہور تصنیف ہے۔ فارسی زبان میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے اور صاحب شفاعت ہونے اور دوسرے فضائل و کمالات کو براہین قاہرہ سے ثابت کیا ہے۔ تحقیق الفتویٰ میں سوالات قائم کرکے ان کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب کچھ عرصہ ((۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء) ہوا جب مکتبہ قادریہ اندرون لوہاری دروازہ لاہور نے مع اصل اور ترجمہ کے باضافۂ مقدمہ پہلی بار اسے شائع کیا ہے۔

رسالہ قاطیغوریاس

علامہ کا یہ رسالہ جوہر اور عرض کی تحقیق میں ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہے۔ ساٹھ صفحات پر ہے۔ اب تک یہ طبع نہیں ہوا ہے۔

رسالہ علم و معلوم

اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ رضا لائبریری رامپور میں اس کا ایک مخطوطہ ہے۔ یہ

رسالہ بھی اب تک طباعت کا منت پذیر نہیں ہوا ہے۔ رسالہ کی اہمیت کے لئے علامہ فضل حق کا نام کافی ہے۔

حاشیہ افق المبین

یہ حاشیہ علامہ فضل حق خیرآبادی کی اہم تصانیف میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے قلمی نسخے خاص خاص لائبریریوں میں اور شخصی خزینۂ کتب میں محفوظ ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خودنوشت نسخہ ہے جو ناقص الآخر ہے۔

استاد محترم مولانا معین الدین اجمیری کے کتب خانہ میں یہ نسخہ بڑی تقطیع پر لکھا ہوا تھا اور ضخامت بھی خاصی تھی۔ اب تک اس گوہر گرانمایہ کی طباعت کی نوبت نہیں آئی۔ کاش علامہ کے صاحب ثروت ارادت مندان کی غیر مطبوعہ تصانیف کے شائع کرنے کی طرف توجہ کرتے یا کوئی علمی ادارہ حکمت ودانش کی کتابوں کے تحفظ کے جذبہ سے ان کو طبع کرا دیتا۔

شرح تہذیب الکلام

شمس العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادی کی ملکیت میں اس کا جو نسخہ تھا ان کے رحلت فرمانے کے بعد ملازمین نے ردی میں اس کے اوراق استعمال کر ڈالے۔ کسی اور نسخہ کا اب تک علم نہ ہوسکا۔

حواشی تلخیص الشفاء

ہدیہ سعیدیہ میں علامہ فضل حق نے تحریر فرمایا ہے کہ مسائل حکمیہ کے متعلق ہماری ذاتی تحقیق حواشی تلخیص الشفاء میں ہے۔ تلخیص الشفاء علامہ فضل امام خیرآبادی کی تصنیف ہے۔ اس پر علامہ فضل حق خیرآبادی نے حواشی لکھے ہیں۔ اس کتاب کے کسی نسخہ کا اب تک علم نہ ہوسکا۔

رسالہ فی تحقیق حقیقۃ الاجسام

اس رسالہ میں اجسام کی حقیقت پر علامہ فضل حق نے محققانہ بحث کی ہے۔ الہدیۃ السعیدیہ کے ص ۱۹ پر اس رسالہ کا ذکر موجود ہے:

"و للقوم فی هذا المقام اقوال قد فرغنا عن ابطالها فی حواشینا علٰی تلخیص الشفاء و رسالتنا المعقودة فی تحقیق حقیقة الاجسام۔"

یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس رسالہ کی ضخامت کیا ہے اور اس کا کوئی نسخہ کسی لائبریری یا شخصی کتب خانہ میں محفوظ ہے یا نہیں؟

رسالہ تشکیک فی الماھیات

تشکیک فی الماھیت کا مسئلہ فن کے امہات مسائل میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ عہد قدیم سے بحث و تمحیص کا موضوع رہا ہے۔ علامہ فضل حق نے فن کے دوسرے اہم مسائل کی طرح اس مسئلہ پر بھی اپنے قلم حقیقت رقم کو متحرک کیا ہے۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے۔ خطبۃ التحفۃ العلیہ حاشیہ ہدیہ سعیدیہ میں علامہ کی تصانیف کی فہرست میں اس کا ذکر ہے۔ یہ رسالہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ورودِ دہلی اور سر گرم جد و جہد

حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی)

مولانا فضل حق خیر آبادی آغازِ جہاد یعنی مئی ۱۸۵۷ء ہی سے دہلی میں تھے۔ دہلی ان کا وطن ومسکن تھا۔ ان کے غالب، ان کے آزردہ اور ان کے اہل وعیال بھی یہیں تھے۔ پھر غدر کا آغاز ''رمضان'' میں ہوا تھا اور رمضان عموماً ہر روزہ دار اپنے اہل وعیال میں گذارتا ہے۔ ۲۵رمئی کو عیدالفطر تھی۔ عید پر مسافر ضرور اہل وعیال سے آملتا ہے۔ مختصراً یہ کہ عقلاً ان کا اس زمانے میں دہلی میں ہونا مستبعد اور خلافِ قیاس نہیں، قرینِ قیاس ہے۔

منشی جیون لال کے یہ لکھ دینے سے کہ وہ ۱۶راگست کو بہادر شاہ سے ملے تھے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ اس تاریخ سے پہلے دہلی میں نہیں تھے؟ اور یہ کیا ضروری ہے کہ مولانا جب بھی دربار میں آئے ہوں جیون لال ضرور لکھے؟ مثلاً ۱۹راگست کو بھی عبداللطیف کے بیان کے مطابق مولانا بادشاہ سے ملے تھے۔ (غدر کا تاریخی روزنامچہ از خلیق احمد نظامی) مگر جیون لال کا روزنامچہ خالی ہے۔ اگر جیول لال کے ان الفاظ سے کہ ''مولوی فضل حق شریکِ دربار ہوئے اور انھوں نے ایک اشرفی نذر کی'' یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ یہ پہلی بار شریکِ دربار ہونے کا ثبوت ہے تو جیون لال نے ۱۰راگست کے روزنامچے میں جو یہ لکھا ہے کہ حکیم احسن اللہ شریکِ دربار ہوئے اور ایک اشرفی پیش کی'' (ص ۲۱۳) تو کیا اس کا یہ مطلب ہوا کہ حکیم صاحب بھی پہلی بار کہیں سے دہلی ۱۰راگست ۱۸۵۷ء کو آئے تھے اور پہلی بار شریک دربار ہوئے تھے؟

حکیم احسن اللہ خاں نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے کہ مولانا نے بہادر شاہ سے کہا کہ

مجاہدین کی مالی اعانت کیجیے۔ بادشاہ نے خزانہ خالی اور مال گذاری وصول نہ ہونے کا عذر کیا تو مولوی صاحب نے جواب دیا کہ:

> ''آپ کے تمام ملازمین نااہل ہیں...... کسی ہوشیار آدمی کو رسد کی فراہمی پر مامور کیجیے۔ میرے لڑکے (مولانا عبدالحق خیرآبادی) اور دوسرے اعزہ تحصیل داری کا کام انجام دیں گے اور رسد بھی فراہم کریں گے۔''

مولوی ذکاء اللہ دہلوی لکھتے ہیں:

> ''جس تاریخ کو سپاہ آئی (۱۱ رمئی) دوسرے روز (۱۲ رمئی) قلعے میں اکابر شہر کی ایک مجلس مقرر ہوئی کہ شہر کا اور سپاہ کی رسد رسانی کا انتظام کیا جائے۔ اگر بندوبست نہیں ہوگا تو وہ (سپاہی) سارے شہر کو لوٹ کر کھا جائیں گے۔ اس کا اہتمام محبوب علی صاحب اور میر نواب پسر تفضّل حسین خاں وکیل کے سپرد ہوا۔'' (ص ۶۷۹۔ تاریخ عروج عہد انگلشیہ)

حکیم احسن اللہ نے مولانا اور بہادر شاہ کی گفتگو کی تاریخ نہیں لکھی، مولوی ذکاء اللہ نے تاریخ متعین کردی ہے۔ مولانا کے مشورے کی بنا پر ان کے ایک عزیز میر نواب کو رسد رسانی کی ذمہ دار سب کمیٹی کا رکن بنا دیا گیا۔ میر نواب مولانا کے داماد سید احمد حسین رسوؔا خیرآبادی کے حقیقی بھائی تھے۔ احمد حسین اور میر نواب دونوں سید تفضّل حسین خاں کے بیٹے تھے جو غالبؔ کے دوست تھے۔ ''سبد باغ'' میں سید صاحب کے نام غالبؔ کے ۷ خطوط ہیں۔ مومنؔ خاں سے سید تفضّل حسین خاں کے تعلقات اور بھی گہرے تھے۔ انھوں نے مومنؔ کے بیٹے احمد نصیر کو متبنیٰ کرلیا تھا۔ ''انشائے مومن'' میں کئی خطوط سید صاحب کے نام ہیں۔ مومنؔ نے سید صاحب کے مکان کی تعمیر، باغ کی تعمیر وغیرہ پر بھی قطعاتِ تاریخ کہے تھے اور میر نواب کی شادی پر بھی (۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء) قطعۂ تاریخ لکھا تھا۔ (کلیاتِ مومنؔ۔ ص ۱۸۹)

بہر حال میر نواب مولانا فضل حق کے قریبی عزیز اور معتمد تھے اور ان کا دور کنی سب کمیٹی میں ۱۲ رمئی ۱۸۵۷ء کو انتخاب مولانا فضل حق کی بہادر شاہ سے ۱۱ رمئی کی گفتگو کے نتیجے میں ہوا تھا۔

مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

> ''انھوں (مولانا فضل حق) نے بادشاہ (بہادر شاہ) کے لئے ایک دستور

العمل سلطنت لکھا تھا۔'' (تاریخ عروجِ سلطنت انگلشیہ۔ص ۶۸۷)

مولوی ذکاء اللہ ہی کا بیان ہے کہ:

''۹؍جولائی ۱۸۵۷ء کو اول حکم بادشاہ کا جو صادر ہوا وہ یہ تھا کہ گائے کہیں ذبح نہیں کی جائے گی۔'' (ایضاً ۶۶۰۔ نیز غدر کے صبح وشام۔ص ۱۶۳۔منشی جیون لال)

ظاہر ہے کہ ۹؍جولائی کو جس دستور کی پہلی دفعہ باقاعدہ نشر اور نافذ کردی گئی تھی وہ دستور اُسی دن تو بہادر شاہ کو پیش نہیں ہوا ہوگا؟ بہادر شاہ کے مطالعہ، نقد ونظر، ردوکد، تذبذب وتامل اور اس کے مشیروں کے مشوروں کی ہفت خواں طے ہونے کے بعد اس کی بعض دفعات کے نشر ونفاذ کا فیصلہ ہوا ہوگا۔ اور یہ بات تو بہادر شاہ سے متعلق تھی۔ جس شخص نے اسے مرتب کیا تھا تو یہ سلطنت کا دستور تھا، خطوطِ غالب نہیں تھے کہ بیٹھے اور لکھ مارا۔ مطالعہ، فکر ومشورت کی جانے کن کن جاں کاہیوں کے بعد یہ تسوید وتبییض کی منزل سے گذرا ہوگا۔

بہر حال! مولوی ذکاء اللہ کے دونوں مندرجہ بالا اقتباسات سے مولانا فضل حق کا جولائی سے بہت پہلے دہلی میں ہونا ثابت ہوتا ہے اور حکیم احسن اللہ خاں اور مولوی ذکاء اللہ کے سابقہ اقتباسات سے مولانا کا ۱۱؍مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں ہونا متعین ہوجاتا ہے۔

ڈاکٹر مہدی حسین نے بھی ذکاء اللہ کے اس اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مولانا آغاز غدر کے فوراً بعد (شارٹ لی آفٹر دی آؤٹ بریک آف میوٹنی) دہلی آگئے تھے۔ (ص ۳۸۹)

مولانا نے ۲۶؍جولائی کو فارسی میں ایک خط بنام مرزا مغل لکھا ہے۔ جس میں مطالبہ کیا ہے کہ ان کی جنرل بخت خان سے ملاقات میں جو گفتگو ہوئی ہے اس کی تفصیل سے مجھے (فضل حق) آگاہ کریں۔ (میوٹنی پیپرس بکس ۱۰۰ نمبر ۹۶، ۲۶؍جولائی۔ ڈاکٹر مہدی حسین۔ ۳۹۱)

مالک رام صاحب نے انقلاب ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق کے عدم شرکت کا افسوسناک اور بے بنیاد ذکر اپنے اس مضمون (تحریکِ دہلی جون ۱۹۶۰ء) میں کیا ہے۔ جس میں انھوں نے مولانا فضل حق کے مقدمہ کی مِسل نیشنل آرکائیوز آف انڈیا سے حاصل کرکے اس کے مشمولات کا اردو ترجمہ شائع کردیا ہے۔ اس مِسل میں وہ فیصلہ بھی اسپیشل کمشنر نے مولانا کے مقدمے کا دیا تھا۔ اس میں مولانا کی دہلی کی باغیانہ سرگرمیوں کا اس طرح ذکر کیا ہے:

''اس کی گرفتاری کے بعد دہلی سے اس کے پرانے تعلقات کے باعث

وہاں کے حکام سے بھی اس کے متعلق استصواب کیا گیا تو کمشنر دہلی نے اس کے جو جوابات تحریر کیے ان سے معلوم ہوا کہ ۱۸۵۷ء میں دہلی میں بھی اس کی سرگرمیاں بعینہٖ اسی قسم کی (باغیانہ) تھیں...... وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے وہ دیدہ و دانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بقدم چلتا رہا۔''

سقوطِ دہلی کے بعد اودھ میں مولانا نے تحریکِ جہاد میں جو حصہ لیا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کمشنر لکھتا ہے:

''وہ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کے دوران میں بغاوت کا ''سرغنہ'' رہا اور دہلی اور اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور قتل کی ترغیب دی...... اس نے بوندی کے مقام پر ۱۸۵۸ء میں باغی سرغنے ممو خاں کی مجلسِ مشاورت میں ''نمایاں حصہ'' لیا۔ اس نے بوندی کے مقام پر مئی ۱۸۵۸ء میں ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کو قتل کرنے کی ترغیب دی...... اس نے قرآن کی آیات پڑھیں اور ان کے من مانے معنی کیے اور اصرار کیا کہ انگریزوں کے ملازم کافر اور مرتد ہیں اور اس لئے شریعت کے نزدیک ان کی سزا قتل ہے...... وہ باغیوں کی مجلس شوریٰ (پریوی کونسل) کا اہم ''رکن'' تھا...... یہ بات ان ایام میں عام طور پر مشہور تھی کہ چند آدمی بیگم (حضرت محل) کے مشیرانِ خاص ہیں۔ باغی فوج میں ان کی ''اربعہ شوریٰ'' کے نام سے شہرت تھی، بلکہ کبھی کبھی انھیں ''کچہری پارلیمنٹ'' کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ اس شوریٰ میں ملزم (مولانا) بہت ممتاز تھا...... یہ تو ظاہر ہے کہ ملزم بہت قابل آدمی ہے، لیکن جس طرح اوپر بیان ہوا اس نے بے ایمانہ ہوس یا مذہبی تعصب کے باعث باغیوں سے اپنا رشتہ جوڑا اور ان کا مشیر بن گیا۔ وہ خطرناک ترین آدمی ہے جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس لیے انصاف اور امن عامہ کا تقاضا ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے...... ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنا چاہیے اور اسے خاص طور سے

ہندوستان سے خارج کردینا چاہیے۔"

عدالت کے اس فیصلے کے علاوہ ہم مولانا فضل حق کی شرکت جہاد کے ثبوت میں پانچ معاصرین کی شہادت پیش کرتے ہیں:

(۱) منشی جیون لال کا گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے جو ۱۶راگست ۲/۶/۷ رستمبر کو لال قلعے میں مولانا کو موجود پاتا ہے۔ ایک دن مولانا نے بادشاہ سے صورت حالات کے متعلق گفتگو کی۔ ایک دن مولانا نے بادشاہ کو (موجودہ) یوپی میں مجاہدین کی سرگرمیوں کے متعلق اطلاع فراہم کی۔ ایک دن بادشاہ کے دربار میں تمام امراؤ رؤسا کے ساتھ مولانا بھی شریک ہوئے۔

(۲) ایک دوسرا معاصر عبداللطیف ۱۹راگست ۱۸۵۷ء کے روزنامچے میں لکھتا ہے:

"جب ہنگامہ برپا ہوا تو مولوی فضل حق آئے۔ دربار میں حاضر ہوئے۔ نذر پیش کی۔ روپیہ صدقے اتارا۔ انھیں انتظام سنبھالنے کی خواہش تھی۔"

(ص ۹۶۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ۔ مرتبہ خلیق احمد نظامی)

(۳) دورانِ غدر میں دہلی کے کوتوال سید مبارک شاہ رام پوری (قاضی فیض اللہ کے بعد کوتوال شہر دہلی) کا بیان ہے کہ جنرل بخت خان، مولوی سرفراز علی اور مولانا فضل حق پر مشتمل ایک کنگ کونسل تشکیل دی گئی۔ (انڈیا آفس منوسکرپٹس آف آر ایم ایڈورڈس۔ ٹرانسلیشن آف سید مبارک شاہز نیریٹیو آف سیز آف دی دہلی، بحوالہ گریٹ ریولیشن آف ۱۸۵۷ء۔ ص ۱۸۲۔ از ڈاکٹر سید معین الحق کراچی ۱۹۶۸ء)

(۴) انگریزوں کا ایک مخبر تراب علی یکم ستمبر ۱۸۵۷ء کے خفیہ خبرنامے میں برطانوی حکام کو مطلع کرتا ہے کہ باغیوں نے ایک انتظامی مجلس تشکیل دی ہے جس کا نام انھوں نے کوٹ (Kote) (کذا) رکھا ہے۔ اس کے ارکان میں جنرل غوث محمد خاں، بریگیڈیر ہیرا سنگھ، جنرل بخت خان، محمد شفیع رسالدار، حیات محمد رسالدار، قادر بخش صوبے دار سفر مینا، نتھو صوبیدار، ہردت صوبیدار وغیرہ کے علاوہ ہر رجمنٹ کے پانچ پانچ سپاہی بھی شامل ہیں اور

"Molvi Fazllehaq is Also A Member"

(مولوی فضل حق بھی اس کورٹ کے ایک رکن ہیں) (میوٹنی ریکارڈ کرسپنڈنس۔ لاہور ۱۹۱۱ء۔ مراسلہ ۲۷۹۔ از جی سی بارنس کمشنر کلکٹر سیس ستلج

بنام سکریٹری چیف کمشنر پنجاب۔ مورخہ ۳ر ستمبر ۱۸۵۷ء)

(۵) ایک اور نامور معاصر حکیم احسن اللہ خاں اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

''دوسرے روز مولوی فضل حق آئے اور نذر پیش کی۔ وہ باغی فوج کی بڑے زور شور سے تعریف کر رہے تھے۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا! اب وقت کا تقاضہ ہے کہ باغیوں کو رقم اور سامانِ رسد کی مدد پہنچائی جائے تا کہ انھیں کچھ سہارا ہو۔ بادشاہ نے کہا رقم کہاں ہے؟ رہا رسد کا تو وہ پہنچی تھی، مگر ناکافی تھی اور اس کی وجہ ان باغیوں کا عوام کے ساتھ غلط رویہ ہے۔

مولوی صاحب نے کہا! حضور کے تمام ملازمین نا اہل ہیں۔ دور اور قریب کے تمام حکمرانوں سے رقم کا مطالبہ کرنے کی اجازت دیجیے اور کسی ہوشیار آدمی کو رسد کی فراہمی پر مامور کرنے دیجیے۔ میرے لڑکے (مولانا عبدالحق) اور دیگر اعزہ تحصیل کا کام انجام دیں گے اور رسد بھی فراہم کریں گے۔

بادشاہ نے جواب دیا! آپ تو یہیں ہیں، آپ انتظام سنبھالیے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا! میرے بھتیجے اور دوسروں کو گوڑگانوہ کی تحصیلداری اور کلکٹری کا پروانۂ تقرر جاری کیا جائے وہ سب انتظام کرلیں گے اور الور، جھجر، بلّب گڑھ اور پٹیالہ کے راجاؤں کے نام بھی (رقم کے مطالبے کے) پروانے جاری کیجیے۔ پٹیالہ کا راجہ اگرچہ انگریزوں سے ملا ہوا ہے لیکن اگر دوستانہ مراسلت کی جائے تو وہ ساتھ آجائے گا۔ بادشاہ نے بتایا کہ پیرزادہ ابوالسلام کی درخواست پر بخت خان نے راجہ پٹیالہ کو ایک پروانہ بھیج دیا ہے، مگر ابھی تک اس کا جواب نہیں آیا۔

مولوی صاحب نے کہا میں اپنے بھائی (فضل عظیم) کو جو راجہ کے یہاں ملازم ہیں، لکھوں گا کہ وہ جلد جواب بھجوائیں۔

مولوی صاحب جب بھی بادشاہ کے پاس آتے بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جہاد کی مہم میں اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں اور ان کے ساتھ باہر (میدان میں) بھی نکلیں۔ فوجی دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں ورنہ اگر انگریز جیت گئے تو صرف خاندان تیموریہ نہیں بلکہ تمام مسلمان

نیست و نابود ہو جائیں گے۔ (یادداشت حکیم احسن اللہ خاں۔ ص ۲۳۔
مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق (کراچی) ۱۹۵۸ء)

تقریباً یہی بات حکیم احسن اللہ نے بہادر شاہ کے مقدمے کے دوران عدالت میں شہادت دیتے ہوئے کہی تھی:

”زمین داران گوڑ گانوہ نے بادشاہ کو ایک درخواست ارسال کی تھی جس میں بدنظمی کا ذکر کر کے التجا کی تھی کہ کوئی افسر نظم و نسق کے لئے مقرر کیا جائے۔ مولوی فضل حق نے جو الور سے آئے تھے، اپنے بھانجے کا (جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا) کی سفارش کی کہ وہ وہاں مقرر کر دیا جائے، کیوں کہ گورنمنٹ برطانیہ کے دورِ حکومت میں بھی وہ اس ضلع میں مقرر تھا۔ چنانچہ یہ شخص ضلع دار مقرر کیا گیا، مگر میں آگاہ نہیں ہوں کہ وہ گوڑ گانوہ گیا یا نہیں؟ البتہ اتنا معلوم ہے کہ زوالِ دہلی کے ۱۵/ ۲۰ روز قبل یہ تقرر ہوا تھا۔ مولوی فضل حق نے بھی کئی تحصیل داروں کو ضلع دار کی نیابت میں مقرر کیا گیا تھا۔“ (بہادر شاہ کا مقدمہ۔ ص ۲۵۶ و ۲۵۷)

انگریزوں کے جاسوس جیون لال نے اپنے روزنامچے میں اس تاریخ کا تعین کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

”۱۹/ اگست ۱۸۵۷ء: عبدالحق خلف مولوی فضل حق اور مولوی فیض احمد لگان وصول کرنے کی غرض سے گوڑ گانوہ گئے۔“ (ص ۲۲۲۔ غدر کی صبح و شام۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۲۶ء)

یہ پانچوں معاصر شہادتیں ان کی دہلی کی باغیانہ سرگرمیوں میں شرکت سے متعلق تھیں۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں سقوطِ دہلی کے بعد مولانا نے دہلی کو بادیدۂ نم الوداع کہا اور اس کے بعد وہ جنوری ۱۸۵۹ء تک مسلسل دوسرے مجاہدین کے ساتھ اودھ میں سرگرم جہاد رہے، اس لئے اودھ کے معاصر حکام کی شہادت ملاحظہ ہو:

اودھ کے چیف کمشنر کا سکریٹری ہمیر پور کے کلکٹر کے نام ۸/ دسمبر ۱۸۵۸ء کو اپنے سرکاری مراسلے میں لکھتا ہے:

”باغی بسوا میں جو لکھنؤ سے شمال مغرب میں پچاس میل کے فاصلے پر ہے،

شکست کھا کر ۵/دسمبر کو گنگا فرار ہو گئے...... ان کی تعداد ۹۰۰ سوار، جن میں ۴۰۰ پوری طرح مسلح ہیں اور باقی سپاہیوں کے پاس اسلحہ کافی نہیں ہے۔ ۳۰۰ پیدل وغیرہ تھے۔ ان میں سے ۱۰۰ عورتیں، ۶ ہاتھی، ایک توپ جس کا نام گروہ ہے۔ اس جماعت کے لیڈر فیروز شاہ شہزادہ دہلی، لکڑ شاہ، گلاب شاہ عرف پیرجی، محسن علی خاں ساکن منٹو شمس آباد فرخ آباد (جو خود کو یورپین ظاہر کرتا ہے) اور مولوی فضل حق سابق سررشتہ دار کمشنر دہلی جس کے بہت سے اعزّہ اعلیٰ مناصب حکومت پر ہیں اور جس کا بھائی پٹیالہ میں راجہ ہری سنگھ کا ملازم ہے۔'' (فریڈم اسٹرگل اِن اتر پردیش حصہ دوم ص ۵۶۳ وحصہ پنجم ص ۸۱۰۔ لکھنؤ ۱۹۵۸ء (انگریزی)

یہی سکریٹری ۱۱/دسمبر ۱۸۵۸ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری کے نام اپنے ایک سرکاری مراسلے میں لکھتا ہے:

''مندرجہ ذیل لوگوں کے چلے جانے کے بعد حکومت کو قیامِ امن میں کافی سہولت ہو رہی ہے۔ فیروز شاہ، لکڑ شاہ، مولوی فضل حق، جو ہماری حکومت کا دشمن جاں ہے، حالاں کہ حکومت نے اسے اور اس کے اعزّہ کو اعلیٰ مناصب عطا کیے تھے۔'' (فریڈم اسٹرگل ص ۵۶۵)

لکھنؤ چیف کورٹ میں غدر سے متعلق بستہ (فائل) میں ٹھیک اسی دور کے ایک حاکم کا مراسلہ ہے. جس میں محمدی (ضلع لکھم پور کھیری) کے قرب وجوار میں مولانا فضل حق اور ان کے رفقائے جہاد کی سرگرمیوں کے تجسس کی جو کوشش برطانوی حکام کر رہے تھے اس کا ذکر ہے اور لکھا ہے کہ:

''کچھ لوگ مولوی فضل حق کی صحیح خبر لانے کے لئے بھیجے گئے ہیں جو اپنے متبعین کے ساتھ شاہ آباد کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔'' (فریڈم اسٹرگل ص ۵۱۸)

معاصرین کے بعد اب قریب تر عہد کے مؤرخین کے حوالے بھی ملاحظہ ہوں۔ مولانا کی وفات کے صرف ۹ سال بعد مشہور انگریز مصنف ہنٹر اپنی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے اس وقت کے صدر مدرس علامہ عبدالحق خیر آبادی فرزند علامہ فضل حق خیر آبادی کے متعلق لکھتا ہے۔

''موجودہ ہیڈ مولوی اس عالمِ دین کے صاحبزادہ ہیں، جن کو ۱۸۵۷ء کے غدر نے ''نمایاں کردیا تھا اور جنھوں نے اپنے جرموں کا خمیازہ اس طرح بھگتا تھا کہ بحر ہند کے ایک جزیرے میں تمام عمر کے لئے جلاوطن کردیئے جائیں۔ اس غدار عالم دینِ کا کتب خانہ جس کو حکومت نے ضبط کرلیا تھا اب کلکتہ کالج میں موجود ہے۔'' (ص ۲۹۴۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان از ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر۔ مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین، طبع دوم لاہور ۱۹۵۵ء)

مولوی ذکاءاللہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو سن ستاون میں ۲۵ رسال کے تھے اور دہلی کی جنگِ آزادی کے عینی شاہدوں میں سے تھے۔ اور انھوں نے اس کے ۲۰/ ۲۵ سال بعد ہی اپنی تاریخ مرتب کی۔ ان کا بیان ہے کہ:

''ان (مولانا) کو اس ''بغاوت' کے سبب سے جلاوطنی کی سزا ملی تھی۔''
(ص ۶۸۷۔ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ)

خود مولانا فضل حق خیرآبادی نے اپنے عربی رسالے "الثورة الهندية" (باغی ہندوستان) میں جو واقعاتِ انقلاب ۱۸۵۷ء پر ایک مستند و معتمد دستاویز بھی ہے۔ اگرچہ اپنی سرگرمیوں کے متعلق ازراہِ انکسار اور مدحِ خود سے احتراز کے پیش نظر یا ممکن ہے اس وقت کے مہیب و پُرخطر ماحول کے باعث بہت کم لکھا ہے مگر پھر بھی اتنا ضرور لکھ گئے ہیں کہ دہلی پہنچ کر:

اشرت الى الناس بما اقتضىٰ رأى و قضىٰ به عقلى. فلم يأتمروا بما اشرت و لم يأتمروا بما امرت.

(تحریکِ آزادی کے سلسلے میں) میری جو رائے تھی اور میری عقل کا جو فیصلہ تھا میں نے لوگوں کے سامنے رکھا مگر انھوں نے میری رائے اور میری ہدایت کو نہ مانا۔

اسی طرح انقلاب ہی سے متعلق اپنے قصیدۂ ہمزیہ میں انڈمان سے لکھتے ہیں:

قد قمت ازجي القاعدين الى الوغى.
میں (تھک کر) بیٹھ جانے والوں کو مسلسل ہمت دلاتا رہا۔

....

(ص ۵۷ تا ۹۰۔ فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء۔ از محمود احمد برکاتی ٹونکی۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۵ء)

قواعد و ضوابط کورٹ

ترتیب و تدوین: علامہ فضل حق خیر آبادی

بزمانۂ انقلاب ۱۸۵۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(ترجمہ از فارسی) از آنجا کہ واسطے رفع برہمی سررشتہ اور موقوفی بدانتظامیِ طریقہ فوجی اور ملکی کے مقرر ہونا دستور العمل کا واجب اور مناسب اور واسطے عمل درآمد دستور العمل کے اولاً معین ہونا کورٹ کا ضروری ہے۔ اس لئے حسب ذیل قواعد لکھے جاتے ہیں:

(۱) ایک کورٹ قائم کی جائے اور اس کا نام کورٹ ایڈ منسٹریشن بمعنی جلسۂ انتظامِ فوجی و ملکی رکھا جائے۔

(۲) اس جلسے میں دس آدمی مقرر کیے جائیں، اس تفصیل سے کہ چھ جنگی اور چار ملکی ہوں اور جنگیوں میں دو شخص پلٹن پیادگان سے اور دو شخص رسالہ ہائے سواروں سے اور دو سررشتہ توپ خانہ سے منتخب کیے جائیں اور ملکی چار شخص۔

(۳) ان دس شخصوں سے ایک شخص باتفاق غلبہ آرائے پریسیڈنٹ یعنی صدر جلسہ اور ایک شخص وائس پریسیڈنٹ یعنی نائب صدر مقرر ہو اور رائے صدر جلسہ کی برابر دو رائے کے قرار پاوے گی اور ہر ایک سررشتہ میں بقدر ضرورت سکریٹر مقرر کیے جائیں اور پانچ گھنٹے ہر روز (؟) جلسہ کورٹ کا......

(۴) ان شخصوں کے مقرر ہونے کے وقت حلف ان باتوں کا لیا جائے کہ کام کو بڑی دیانت اور امانت سے بلا رو رعایت، کمال جانفشانی سے اور غور و فکر سے سرانجام

کریں گے اور کوئی دقیقہ دقائق متعلقہ انتظام سے فروگذاشت نہ کریں گے۔ اور حیلۃً اور صراحتاً اخذِ اجرت یا رعایت کسی طرح کی کسی لحاظ سے وقت تجویز امور انتظام کورٹ میں نہ کریں گے۔ بلکہ ہمیشہ ساعی اور سرگرم ایسے امورات سلطنت میں مصروف رہیں گے کہ جس سے استحکامِ ریاست اور رفاہ اور آسائشِ رعیت ہو اور کسی امر مجوزہ کورٹ کو بے اجازت کورٹ اور صاحبِ عالم قبلِ اجراء اوس کے صراحتاً یا کنایتاً کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔

(۵) انتخاب اشخاص کورٹ کا اس طریقے سے کہ غلبۂ آراء سے دو دو شخص پلٹن پیادگان اور رسالہ ہائے سواران سے اور سررشتہ توپ خانہ جنگی سے جو قدیم الخدمت اور ہوشیار اور واقف کار اور لائق و عقیل ہو کیے جاویں اور اگر کوئی شخص ہوشیار، بہت عقیل و فہیم اور لائقِ انصرام کار کورٹ ہو اور شرط قدیم الخدمتی اس میں نہ پائی جائے تو یہ ایک امر خاص ان صورتوں میں مانع تقرر ایسے شخص کا نہ ہوگا اور اسی طرح تقرر چار شخص ملکی کا بھی عمل میں آوے گا۔ بعد مقرر ہونے دس شخصوں کے اگر کوئی شخص جلسۂ انتظام کورٹ میں رائے اپنی کسی امر میں ایسی خلافِ دیانت اور امانت اور محمول اوپر رعایت کسی کے ہووے گا۔ تو...... کامل غلبہ آرائے کورٹ سے وہ شخص موقوف کیا جاوے گا اور دوسرا شخص حسبِ قاعدہ پانچویں (۵) بمقام اس کے انتخاب ہوگا۔

جو امورات انتظام کے پیش آویں اوّل تجویز ان کی کورٹ میں ہوگی —— اور بعد منظوری صاحبِ عالم بہادر کے اطلاع رائے کورٹ سے حضور والا میں ہوتی رہے گی۔

(۷) بعد مرتب ہونے رائے غلبہ آرائے جلسۂ کورٹ سے واسطے منظوری کے پیش گاہ حضور صاحب عالم بہادر میں پیش ہوں گے اور کورٹ ماتحت حکومت صاحب عالم بہادر ممدوح کے رہے گی اور کوئی امر امور انتظامی، جنگی و ملکی کے تجویز کورٹ اور بلا منظوری صاحب عالم محتشم الیہ اور بلا اطلاع حضور والا قابلِ اجرائی نہ ہوگا۔ اور درصورت اختلاف رائے صاحب عالم بہادر بعد تجویز ثانی کورٹ وہ رائے بحالت

اختلاف بوساطت صاحب منظم الیہ پیش گاہ حضور ظلِ سبحانی میں پیش ہو اور اس میں حکم حضور کا ناطق ہوگا۔

(۸) کورٹ میں سوائے اشخاص مقرر جلسہ کے بجز صاحب عالم بہادر اور حضرت ظلِ سبحانی کوئی شخص شریکِ جلسہ اور حاضر نہ ہوگا اور جب اشخاص معینہ کورٹ میں سے بعذر قوی لائقِ پذیرائی ایک شخص اپنے زمرہ مقرر سے حاضر جلسۂ کورٹ نہ ہوسکے تو رائے غلبہ آرائے اشخاص ماقبی حاضرین جلسۂ کورٹ کے بمنزلہ رائے غلبہ رائے کل جلسۂ کورٹ کے متصور ہوگی۔

(۹) جب کوئی شخص کورٹ میں سے بہ نسبت کسی امر کے رائے اپنی پیش کرنی چاہے تو اولاً اتفاق ایک رائے دوسرے شخص کا پہلے کر کے اس وقت رائے اپنی متفق علیہ دو شخص کورٹ میں پیش کریں۔

(۱۰) جس وقت کوئی امر کورٹ میں موافق قاعدہ نویں (۹) کے پیش ہو اول پیش کرنے والا تقریر اپنی کورٹ میں بیان کرے اور جب تک بیان اس کا تمام نہ ہو کوئی شخص اس میں دخل نہ کرے۔ اہل کورٹ میں سے اگر کسی کو کچھ اعتراض ہو تو وہ پہلے اپنا اعتراض ظاہر کرے تا تمام ہونے اس کے بھی کوئی دخل نہ دے۔ اگر معترض پر کوئی تیسرا شخص تقریر درباب اصلاح یا ترمیم کسی طرح کی کمی بیشی کے ساتھ پیش لاوے اور ماقبی اہل کورٹ کو سکوت ہو تو ہر ایک اہل کورٹ اپنی اپنی رائے علیحدہ لکھے۔ بعد ملاحظہ موافق قاعدہ آٹھویں (۸) کے غلبۂ آراء پر عمل ہوگا اور بعد منظوری ہر ایک سررشتہ کے سکریٹر کے پاس بھیجی جائے۔

(۱۱) ہر ایک سررشتۂ فوج کے جو اشخاص حسب قاعدہ دوسرے کے منتخب کیے جاویں گے وہی اشخاص اس سررشتہ کے منتظم اور منصرم مقرر کیے جاویں اور ان کے تحت میں چار آدمی کی کمیٹی حسب طریقہ قاعدہ چوتھے (۴) کے قرار پاوے اور بقدر ضرورت اسے اس کمیٹی میں بھی سکریٹر مقرر ہوں۔ اور جو رائے اس کمیٹی میں غلبہ آرا سے مرتب ہوئے وہ رائے بذریعہ ان شخصوں افسر کمیٹی کے کورٹ میں پیش کی جاوے اور کورٹ

سے موافق قاعدہ ساتویں (۷) کے عمل میں آوے۔اور یہی طریقہ ہر ایک سررشتہ فوجی اور ملکی میں مرعی کیا جاوے۔

(۱۲) ہر وقت بمقتضائے مصلحت کورٹ کو اصلاح اور ترمیم قواعد دستور العمل ہذا کا غلبہ آرا سے اختیار دیا جاوے۔"

....

(منقول از عکس مطبوعہ مقابل ص ۱۸۲ "بہادر شاہ دوم" از ڈاکٹر مہدی حسین (نیز ڈاکٹر سین کی "۱۸۵۷ء" کے مقابل ص ۴۷۔ اور میوٹنی پیپر کے ص ۳۶۔ بکس نمبر ۵۴۱۔۵۳۹)

(ص ۹۵ تا ۹۹۔ فضل حق اور ۱۸۵۷ء۔ مولفہ محمود احمد برکاتی ٹونکی)

☆☆☆☆☆☆☆

سیاسی بصیرت واستقامت اور انقلاب ۱۸۵۷ء

مولانا محمد عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی

علامہ فضل حق خیرآبادی نے حادثۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) اور واقعۂ ہنومان گڑھی (۱۸۵۵ء) دیدۂ عبرت سے دیکھا۔ اکبرشاہ ثانی، اور بہادرشاہ ظفر کی بے بسی اور پھر واجد علی شاہ اختر والیِ اودھ کی معزولی (۱۸۵۶ء) و بے کسی کی علت پر نظر جمائی۔ دہلی اور لکھنؤ کے ان حالات سے ایک حق آگاہ وحساس انسان کو اثر پذیر ہونا ہی چاہیے تھا۔

دوسری طرف عمالِ حکومت ہندوستانی تہذیب و کلچر اور ہندوستانیوں کے مذہب کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ تبلیغ عیسویت کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ عیسائی مشنریاں، مدارس، ہسپتال، اور دوسرے پبلک اداروں سے مذہبی اشاعت اپنا فرض منصبی سمجھ رہی تھیں۔ ان کی دریدہ دہنی کا شکار مقامی مذاہب بن رہے تھے۔ مذہب اسلام پر خصوصیت سے نظرِ توجہ تھی۔ پادری فنڈر اور مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیرخاں اکبرآبادی وغیرہم کے مناظروں (۱۸۵۴ء) سے ہل چل مچی ہوئی تھی۔

عوام کو خیال ہونے لگا تھا کہ حکومت تو گئی ہے اب مذہب پر بھی ہاتھ صاف کیا جارہا ہے۔ ہندوستانیوں کی اصل متاع مذہب ہی ہے۔ یہ تمام نقصان اور مصیبتیں برداشت کرسکتا ہے لیکن مذہب پر آنچ نہیں آنے دیتا۔

سرسید احمد خاں "اسباب بغاوتِ ہندوستان" میں لکھتے ہیں:

> "۱۸۵۵ء میں کلکتہ سے پادری صاحبان ای ایڈمنڈ نے تمام سرکاری ہندوستانی عہدیداروں کے نام گشتی چھٹی بھیجی تھی کہ:
>
> "برٹش راج میں تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی ہے۔ تاربرقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی۔ ریلوے، سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہوگئی۔ مذہب بھی ایک چاہیے۔ اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی

عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔"

علامہ فضل حق کا بچپن، جوانی اور کہولت دہلی میں گذرے۔ آخر میں لکھنؤ پہنچے۔ وہاں کی حالت دہلی سے بھی بدتر پائی۔ بادشاہ دہلی اور والی اودھ برائے نام حکمراں تھے۔ آخر الذکر نے تو لٹیا ہی ڈبودی تھی۔ مسجد ہنومان گڑھی شہید ہوئی۔ مسلمان مجاہدین کفار کے ہاتھوں خاک وخون میں لتھڑے۔ امیر علی شاہ توپ دم ہوئے۔ مجاہدین سرکاری فوج کے ہاتھوں کشتہ ہوئے۔ ناموسِ اسلام کی بے عزتی اور اسلامی شعائر کی بربادی پر بھی واجد علی شاہ کو عیش وعشرت کی پڑی تھی۔ علامہ صدر الصدور تھے۔ ان واقعات سے متاثر ہو کر لکھنؤ چھوڑ کر ۱۸۵۶ء میں الور چلے گئے مگر دل بے چین رہا کہ اتنے میں کچھ شورش اٹھتی نظر آئی۔ دربار دہلی سے راجاؤں کے نام خطوط بھی روانہ ہوئے۔ علامہ نے راجہ الور سے بھی گفتگوئیں کیں۔ وہ رام نہ ہوا۔ وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ راہ میں زمینداروں کو تلقین کرتے ہوئے چلے۔ اس سے قبل مولوی احمد اللہ شاہ دلاور جنگ مدراسی سے سرگوشیاں ہو چکی تھیں۔ دلاور جنگ فیض آباد چلے گئے تھے اور ہنگامہ ہوتے ہی لکھنؤ آ کر قابض ہو گئے۔

شاہ اودھ کی معزولی، بادشاہِ دلی کی نام نہاد خطابات سے منصوبہ محرومی اور مذہب عیسوی کی بہ جبر نشرو اشاعت نے فرنگیوں کو بالکل بے نقاب کر دیا تھا۔

کارتوسوں کی چربی سے دل کا غبار آتش فشاں بن کر پھوٹ پڑا۔ اس نے بارود پر فلیتہ کا کام دیا۔ لکھنؤ میں ۱۲ رذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۵ رجولائی ۱۸۵۷ء بروز یکشنبہ مرزا رمضان علی عرف برجیس قدر بن واجد علی شاہ کو بیگم حضرت محل کی منظوری سے ممو خاں کی سرکردگی میں فوجی سالاروں نے باقاعدہ تخت نشیں کر دیا۔ (قیصر التواریخ جلد دوم۔ ص ۲۲۵۔ مصنفہ میر محمد زائر)

احمد اللہ شاہ (مدراسی دلاور جنگ) پہلے قابض ہو کر شہر کا بندوبست کر چکے تھے۔ اب تلنگے جابجا متعین ہوئے۔ شاہ جی سخت سست کہہ کر چپ ہو گئے۔ بیلی گارڈ پر انگریزوں سے چھ روز تک لڑائی ہوتی رہی۔ ۱۰ رجولائی کی شام کو جمعہ کے دن پسپا ہو کر ہٹ آئے۔ (قیصر التواریخ جلد دوم۔ ص ۲۳۰۔)

علامہ الور سے نشرو اشاعت کرتے ہوئے مئی ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے۔ میرٹھ اور دوسری چھاؤنیوں میں کارتوسوں کا قضیہ زور پکڑ چکا تھا۔ گائے اور سور کی چربی کی آمیزش کی خبر سے ہندو اور مسلمان فوجی بگڑ بیٹھے تھے۔ روٹی کی ٹکیا کی تقسیم کسی خاص اسکیم کے ماتحت گاؤں گاؤں پہلے سے ہو ہی ہو چکی تھی۔

میرٹھ سے دہلی پر ''باغی'' فوج نے ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کو حملہ کر دیا۔ قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوا۔ بادشاہِ دہلی سرگرمیوں کا مرکز بنے۔ علامہ بھی شریک مشورہ رہے۔ منشی جیون لال اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں:

۱۶راگست ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے۔ انھوں نے اشرفی نذر میں پیش کی اور صورتِ حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔

۲رستمبر ۱۸۵۷ء: بادشاہ دربار عام میں تشریف فرما ہوئے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی فضل حق، میر سعید علی خاں اور حکیم عبدالحق آداب بجالائے۔

۶رستمبر ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے۔ اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے۔

۷رستمبر ۱۸۵۷ء: بادشاہ دربار خاص میں رہے۔ حکیم عبدالحق، میر سعید علی خاں، مولوی فضل حق، بدرالدین خاں، اور دیگر تمام امرا وروٴسا شریک دربار رہے۔ (غدر کی صبح و شام۔ روزنامچہ منشی جیون لال۔ ص ۲۱۷، ۲۴۰، ۲۴۶، ۲۴۷)

اس روزنامچہ سے علامہ کی باخبری اور انقلابی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ موجودہ صورت حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔ بادشاہ سراسیمہ تھے۔ شہزادوں کی لوٹ کھسوٹ اور تخت شاہی کی تمناؤں نے باہمی رقابت کا میدان گرم کر رکھا تھا۔ عمائد شہر میں دو گروہ تھے۔ ایک بادشاہ کا ہمنوا اور دوسرا حکومت کمپنی کا بہی خواہ۔ فوجیوں میں طمع اور لالچ نے گھر کر لیا تھا۔ دو ایک جماعتیں مقصدِ اعلیٰ کو سامنے رکھے ہوئے تھیں۔ ایک جماعت مجاہدین کی تھی۔ دوسری روہیلوں کی۔ یہ جنرل بخت خاں کی سرداری میں دادِ شجاعت دے رہی تھی۔

علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہونچے۔ مشورہ کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علما کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی، سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کر دیئے۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی۔ (تاریخ ذکاء اللہ)

جنرل بخت خاں کی اسکیموں میں مرزا مغل آڑے آتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ سے

سرکار میں معافی کا خط بھی بھجوادیا تھا۔کوئی سنوائی نہ ہوئی۔ مرزا مغل کی وجہ سے فوج میں پھوٹ پڑ گئی۔ جنرل بخت خاں سے لوگ بگڑ گئے۔ کمپنی کی فوج نے ۱۴رستمبر ۱۸۵۷ء کوشہر دہلی پر حملہ کردیا۔اور ۱۹رستمبر کو مکمل طور پر انگریز قابض ہو گئے۔

بادشاہ جو اس درمیان میں قلعہ سے نکل کر مقبرۂ ہمایوں میں پناہ گزیں ہو چکے تھے مع متعلقین گرفتار کر کے قلعہ میں نظر بند کر دیئے گئے۔ تین شاہزادوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا اور ان کے سروں کو خوان پوش سے ڈھک کر خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے بطور تحفہ پیش کیا گیا۔انھیں میں مرزا مغل بھی تھے۔ جنرل بخت خاں اپنی فوج اور توپ خانہ کو نکال لے گئے۔ بادشاہ سے کہا! آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ مگر وہ زینت محل اور مرزا الٰہی بخش کے ہاتھ میں کھلونا بن چکے تھے، آمادہ نہ ہوئے۔ جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد وغیرہم سب لکھنؤ چلے گئے۔

یہ سب لوگ لکھنؤ پہنچ کر احمد اللہ شاہ دلاور جنگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ خوب خوب مقابلے رہے۔ بالآخر شکست کھا کر شاہجہاں پور روانہ ہو گئے۔ محمدی (شاہجہاں پور) میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی۔ نانا صاحب پیشوا، مولوی عظیم اللہ کان پوری، شہزادہ فیروز شاہ وغیرہم سب یہیں جمع ہو گئے۔ آخری جنگ انگریزوں سے شاہجہاں پور میں ہوئی۔ یہاں بھی شکست کا منھ دیکھنا پڑا اور یہ سب لوگ نیپال چلے گئے۔ دلاور جنگ کو راجہ پوائیں بلد یو سنگھ نے دعوت کے بہانے سے بلا کر دھوکہ سے ۱۵رجون ۱۸۵۸ء مطابق ۲رذیقعدہ ۱۲۷۴ھ کو شہید کر دیا۔ دریا پار محلّہ جہان آباد، متصل احمد پورہ مسجد کے پہلو میں سپرد فن ہوا۔

علامہ دہلی سے ۲۴رستمبر کو روانہ ہو گئے۔ علامہ نے الثورۃ الہندیہ میں لکھا ہے کہ "انگریزوں کے قبضے کے بعد پانچ دن تک بھوکے، پیاسے مکان کے اندر بند رہے۔ پانچویں روز اہل وعیال اور ضروری سامان لے کر شب میں چھپ کر نکلے، دریا عبور کیے، میدان قطع کیے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی علی گڑھی صدر الصدور حیدر آباد دکن (متولد ۲۸رشعبان ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء۔ متوفی ۲۶رشوال ۱۳۶۹ھ/ ۱۱راگست ۱۹۵۰ء بروز جمعہ بعمر ۸۶ سال) کا بیان ہے کہ علامہ مع متعلقین بھیکن پور ضلع علی گڑھ آ کر ۱۸رروز رہے۔ صاحبزادہ مولانا عبدالحق بھی ساتھ تھے۔ اٹھارہ روز کے بعد عم محترم نواب عبدالشکور خاں رئیس بھیکن پور نے سانکرہ کے گھاٹ سے جو بھیکن پور سے آٹھ میل دور، اور موصوف کے عزیزوں کی

عملداری میں واقع تھا۔ اپنے انتظام سے بدایوں اور بریلی کی طرف اتروایا تھا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر نے مجھے وہ کمرہ بھی بتایا جس میں علامہ فروکش ہوئے تھے۔ گڑھی میں برج پر جانب مشرق واقع تھا۔ (۱۹۴۷ء کے بعد پوری گڑھی ویران ہو چکی ہے) نواب صدر یار جنگ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ علامہ کے ورود بھیکن پور (علی گڑھ) کے ۹ رسال بعد بچپن میں والد ماجد اور عم محترم سے یہ واقعات سُنے اور فطرت خداداد کی بنا پر انھیں یاد رکھا۔

موصوف نے یہ بھی بیان کیا کہ والد ماجد (محمد تقی خاں) اور مولانا عبدالحق میں کافی تعلقات بھی ہو گئے جو بعد میں خط و کتابت کی شکل میں جاری رہے۔ موصوف ہی کی یہ بھی روایت ہے کہ علامہ، صاحبزادہ کو سبق پڑھاتے رہے۔ بھیکن پور نواب صدر یار جنگ بہادر اور راقم السطور کا مولد و منشأ طفولیت بھی ہے۔

اس طرح ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی اور ۱۷۹۹ء کی جنگ میسور کی طرح ۱۸۵۷ء کی یہ جنگ آزادی بھی ہندوستانیوں کی شکست اور انگریزوں کی فتح پر ختم ہوئی۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

۱۹ رستمبر (۱۸۵۷ء) کے بعد ہندوستانیوں پر جو مصائب کے پہاڑ ٹوٹے اس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ یوں تو دہلی نے بہت سے ہنگامے دیکھے تھے۔ نادرشاہ درّانی کا ایام عیدالاضحیٰ میں قربانی کے جانوروں کی جگہ انسانوں کا ذبح عام اور شہر کی نالیوں میں پانی کے بجائے خون کی روانی دیکھی تھی۔ ''ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت'' کے مطابق شہر کا اجڑنا اور دوسری جگہ آباد ہونا، دارالسلطنت پر حملہ آوری، اور'' ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها و جعلوا اعزة اهلها اذلة۔'' کے بموجب شرفا کی ذلّت و خواری بھی نظر سے گذری تھی۔

مگر ایسے مظالم!

لا عين رأت و لا اذن سمعت و لا خطر على قلب بشر''
نہ آنکھوں نے دیکھے، نہ کانوں نے سنے۔ نہ انسان کے دل میں کبھی ان کا خطرہ بھی گذرا۔ الامان و الحفيظ۔

سر کنم گریہ اگر تابِ شنیدن داری
سینہ بشگافم اگر طاقتِ دیدن داری

ان مظالم کو لکھتے ہوئے دل لرزتا ہے۔ سینۂ قلم شق اور جگر قرطاس پارہ پارہ ہوا جاتا ہے۔ انتقام کی کوئی حد ہوتی ہے۔ اگر ہندوستانی فوجیوں نے مذہبی جوش اور ملکی جذبے میں مجنون بن کر اپنی جہالت وحماقت سے کچھ یورپین بچوں اور عورتوں کو قتل کر ڈالا تھا تو یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ عوام جوش میں آکر ہمیشہ اسی قسم کی حرکتیں کرتے رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء میں انگریز جیسی دعویدارِ تمدن وتہذیب قوم نے یہ شرمناک اور انسانیت سوز حرکات جوش میں نہیں، ہوش میں کیں۔ غلامی کی لعنت سے متاثر ہوکر نہیں، فاتح وقابض ہونے کے بعد کیں۔ جہالت وحماقت سے نہیں، بزعم خود دانشمندی وفرزانگی کے ماتحت کیں۔ غفلت ونادانستگی سے نہیں بلکہ قصداً اور دانستہ کیں۔ خصوصیت سے مسلمانوں کے ساتھ جو ذلّت آمیز اور جگر خراش برتاؤ کیا وہ بیان سے باہر ہے۔

زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سلوا کر گرم تیل کے کڑھاؤ میں ڈلوانا، سکھ رجمنٹ سے علیٰ رؤس الاشہاد اِغلام کرانا، فتح پوری مسجد سے قلعہ کے دروازے تک درختوں کی شاخوں پر مسلمانوں کی لاشوں کا لٹکانا، مساجد کی بے حرمتی خصوصاً شاہجہانی جامع مسجد دہلی کے حجروں میں گھوڑوں کا باندھنا، عبادت کی جگہ دفاتر قائم کرنا اور حوض میں وضو کے پانی کی جگہ گھوڑوں کی لید ڈالنا، ناقابل معافی اور غیر ممکن التلافی جرم ہے۔

منصف مزاج انگریز بھی اس کی مذمت کیے بغیر نہ رہ سکے۔ تفصیل کے لئے دیکھیے۔ "انقلاب ۱۸۵۷ء کا دوسرا رخ" مترجمہ شیخ حسام الدین بی۔اے امرتسری سابق صدر مجلس احرار اسلام ہند۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ مسلمان قوم کو بھی فتح وظفر کے ایسے مواقع پیش آئے ہیں لیکن ان کا دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک رہا۔ اپنوں کا نہیں غیروں کا بیان سنیے۔ دوستوں کی نہیں دشمنوں کی تحریریں دیکھیے۔

کون نہیں جانتا کہ چودہ سو سال قبل ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوا تو خدا کے آخری برگزیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دشمنوں کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار فرمایا جنھوں نے ذلّت ورسوائی اور مصائب وآلام پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ تالیاں بجائی تھیں۔ پتھر مارے تھے۔ دھول اڑائی تھی۔ آوازے کسے تھے۔ سِڑی، سودائی، مجنوں اور دیوانہ خطابات دیئے تھے۔ راستے میں کانٹے بچھائے تھے۔ پشت پر اونٹ کا بوجھ لادا تھا۔ گردن میں چادر کا پھندا ڈال کر کھینچا تھا۔

قتل کے منصوبے باندھے تھے۔ اور سب سے آخر یہ کہ وطن سے نکال کر بے گھر اور بے در بنایا تھا۔ اس شاہِ دوجہاں نے فتح کے بعد اعلان کیا: جو ہتھیار رکھ دے اسے امان۔ جو معابد میں مشغول عبادت ہو وہ محفوظ۔ جو ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ مامون۔

جب دشمنوں کا سامنا ہوتا ہے تو دریافت فرماتے ہیں کہ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟

یک زبان ہو کر کہتے ہیں۔ شریف بھائی اور شریف بھتیجے سے جو توقع ہو سکتی ہے وہی ہم بھی رکھتے ہیں۔

جواب ملتا ہے! جاؤ تم سب آزاد ہو۔

کئی سو سال کے بعد اسی قسم کا واقعہ اس شاہِ دوسرا کے ادنیٰ غلام سلطان صلاح الدین ایوبی کو بیت المقدس میں پیش آتا ہے۔ اس خطۂ پاک (فلسطین) پر خلیفۂ دوم حضرت امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خود بہ نفس نفیس صلح و آشتی کے ساتھ قبضہ فرمایا تھا۔ اس وقت سے تقریباً ساڑھے چار سو سال تک پرچم اسلام لہراتا رہا۔ ۱۰۹۹ء عیسوی میں عیسائیوں نے اس پر تسلط قائم کرلیا۔ مگر کس شان سے؟ ایک انگریز مؤرخ ہی کے قلم کے رشحات دیکھیے:

"جب گوڈفرے اور تنکرو، یروشلم کے کوچہ و بازار میں گذرے تھے تو وہاں مردے پڑے اور جاں بہ لب زخمی لوٹتے تھے۔ جبکہ بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو، ان صلیبیوں نے سخت اذیتیں دے کر مارا تھا اور زندہ آدمیوں کو جلایا تھا۔ جہاں قدس کی چھتوں اور برجوں پر جو مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے وہیں ان صلیبیوں نے اپنے تیروں سے چھید کر گرایا تھا۔" (اردو ترجمہ سلطان صلاح الدین ایوبی۔ ص ۲۰۲۔ مصنفہ انگریز مؤرخ سٹیلے لین پول)

۹۰ برس کے بعد ۲۶/ستمبر ۱۱۸۷ء مطابق ۲۷/رجب ۵۸۲ھ کو سلطان نے فوج کشی کر کے اور شاہ رچرڈ وغیرہ سے لڑائیاں لڑ کر فلسطین پر علم اسلام لہرادیا۔ مدتوں کی جنگ کے بعد اس عظیم الشان فتح پر اعلان عام کر دیا کہ دس اشرفی زرِ فدیہ دے کر ہر عیسائی اپنا ساز و سامان لے کر امن و امان کے ساتھ شہر چھوڑ سکتا ہے۔ چالیس دن کی مہلت بھی دی گئی۔

جو لوگ غریب تھے ان میں سے سات ہزار کو شاہِ انگلستان کی رقم سے فدیہ ادا کر کے رہا کرایا گیا۔ کوکبری نے شہر الرہا کے ایک ہزار آرمینیوں کو فدیہ دے کر آزاد کرایا۔ برادر سلطان ملک العادل نے شاہ رچرڈ کی دوستی کی بنا پر سلطان سے ایک ہزار غلام مانگ کر اپ رف سے آزاد کر

دیئے۔ بطریق اعظم اور بلیان سفیر نے بھی جرأت کر کے سلطان سے ملک العادل کے برابر غلام مانگے جو اجازت ملنے پر آزاد کر دیئے گئے۔ باقی ماندہ عیسائیوں کو سلطان نے اپنی طرف سے آزاد کر دیا۔ امرا اور شہسواروں کی بہو بیٹیوں نے فریاد کی کہ ہمارے شوہر اور سرپرست یا تو مارے گئے یا قید و بند میں ہیں۔ ہماری دستگیری کی جائے۔ سلطان نے ان کی آہ و زاری سے متاثر ہو کر قیدیوں کو رہا کیا۔ اور جو مارے گئے تھے ان کے پسماندگان کو خزانے سے اس قدر روپیہ دلایا کہ سب مطمئن اور خوش خوش واپس گئیں۔ (ایضاً۔ ص ۲۰۲ تا ۲۰۵)

یہ تھا مسلمانوں کا انتقام! اور یہ تھی بدترین دشمنوں کے ساتھ رواداری!

''غیر متمدن'' دنیا کے ان تاریخی حقائق کے بعد دورِ تہذیب و تمدن کے علَم بردار یورپ کے ان کرتوتوں پر کون انصاف پسند انسان شرم سے گردن نہ جھکا لے گا؟

علما و امرا و خواص و عوام کی تباہی و بربادی کی داستان بڑی طویل ہے۔ قابلِ ذکر کچھ نام درج کیے جاتے ہیں:

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد پھانسی پانے والے یا گولیوں سے اڑائے جانے والے

(۱) نواب عبدالرحمٰن خاں والی جھجھر (مع ضبطی جائداد)
(۲) راجہ ناہر سنگھ رئیس بلب گڑھ
(۳) نواب مظفر الدولہ
(۴) نواب میر خاں پنشن دار و جاگیر دار پلول
(۵) نواب اکبر خاں بن فیض اللہ خاں بنگش
(۶) احمد مرزا
(۷) میر محمد حسین
(۸) حکیم عبدالحق بن حکیم بخش
(۹) قاضی فیض اللہ کشمیری سررشتہ دار صدر الصدور
(۱۰) میر پنجہ کش، مشہور خوش نویس
(۱۱) نواب محمد حسین خاں
(۱۲) مشہور شاعر مولوی امام بخش صہبائی
(۱۳) نواب احمد قلی خاں (جیل میں موت واقع ہو گئی)
(۱۴) نظام الدین خاں بن حکیم شرف الدین
(۱۵) خلیفہ اسمٰعیل خلف استاد ذوق
(۱۶) محمد علی خاں خلف نواب شیر جنگ خاں
(۱۷) عبدالصمد خاں بن علی محمد خاں رسالہ دار شاہی فوج
(۱۸) دلدار علی خاں کپتان
(۱۹) میاں حسن عسکری صوفی
(۲۰) غلام محمد خاں عم نواب احمد علی خاں رئیس فرخ نگر

دہلی چھوڑ کر غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے والے

(۱) میاں غلام نظام الدین

(۲) نواب غلام محی الدین خاں پنشن دار

(۳) حکیم محمود خاں والدِ مسیح الملک حکیم اجمل خاں

(۴) حکیم مرتضیٰ خاں

(۵) نواب یعقوب علی خاں (گوجروں نے لوٹ کر قتل کر ڈالا)

(۶) مرزا فاضل بیگ

(۷) عبدالحلیم خاں نائب کوتوال (مع ضبطیِ جائداد)

(۸) منشی آغا جان محرر ایجنٹی

(۹) صفدر سلطان بخشی

(۱۰) نواب سید حامد علی خاں رئیس برست

(۱۱) مرزا معین الدین خاں، تھانیدار پہاڑ گنج

(۱۲) محمد حسین خاں تھانیدار بدر پور

(۱۳) لالہ رام جی داس گڑ والے

(۱۴) ضیاء الدولہ خلف حکیم رکن الدولہ

(۱۵) موسیٰ خاں بن حافظ عبدالرحمٰن خاں مختار مرزا نیلی۔

(۱۶) عبدالصمد خاں خسر نواب جھجر

(۱۷) حکیم امام الدین خاں بن حکیم غلام رضا خاں

(۱۸) نواب حسن علی خاں برادر نواب جھجر

(۱۹) سعادت علی خاں خلف حسن علی خاں

(۲۰) میر نواب نائب کپتان

(۲۱) نواب عبدالرحمٰن خاں

(۲۲) نواب علی محمد خاں عم والی جھجر

(۲۳) راجہ اجیت سنگھ عم راجہ نربندر سنگھ رئیس پٹیالہ

(۲۴) غلام فخر الدین خاں، تحصیلدار کوٹ قاسم

ان کے علاوہ حیدر خاں اور اشرف خاں مخبران نے ایک سو سات نوجوانوں کو الور سے گرفتار کرا کے دہلی بھیجا۔ آدھے گوڑ گاؤں میں قتل کر دیئے گئے۔ باقی کو دہلی میں پھانسی دی گئی۔ اسی طرح کے بیسیوں حادثات ہیں۔ کہاں تک بیان کیے جائیں۔

مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مرزا اسد اللہ خاں غالب اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ وغیرہم بھی دھر لیے گئے۔ ان اکابر کو بڑی دشواریوں کے بعد نجات مل سکی۔ پنشنوں اور جاگیروں پر زد پھر بھی باقی رہی۔

سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی، مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریابادی وغیرہم کو بجرمِ بغاوت کالے پانی کی سزا ہوئی۔

علامہ فضل حق کو بھی "باغی" قرار دیا گیا۔ اسیر فرنگ ہو کر بند ہوئے۔ ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۹ء میں لکھنؤ میں مقدمہ چلا۔ ظاہر ہو رہا تھا کہ مولانا بَری ہو جائیں گے۔ چنانچہ پیروکار مقدمہ منشی کرم احمد خیر آبادی نے لکھنؤ سے سید اعظم علی کے نام خیر آباد یہ خط لکھا:

''مدت یک دو روز است کہ جناب مخدوم الاخوان بحسب تقدیر مبتلائے حبس شدہ از سیتاپور بہ لکھنؤ برائے روبکاری صفائی روانہ کردہ شدہ اند۔ زبانی آئندہ ہر گاہی ہم از تحریرات آنجا ہر روز منکشف می شود کہ در امروز فردا بفضلہٖ تعالیٰ رہائی خواہد شد۔

روز بنا برادائے شہادت صفائی، مولوی صاحب مکرم، مولوی نبی بخش صاحب، مشفقی مولوی قادر بخش صاحب و برخوردار مولوی سید ضامن حسین، بموجب درخواست مولوی عبدالحق (خلفِ علامہ) بمعیت ایشاں روانہ لکھنؤ شدہ اند، و ہمگیاں را امید از خدائے کریم است۔ دیگر روز بالضرور مخلصی یافتہ، وارد دولت خانہ خواہد شد۔ اوتعالیٰ ہم چنیں کند۔ ہمہ ہا از خورد و کلاں و ذکور و اناث چشم براہ انتظار کشادہ می باشند۔ و رنج و قلقے عظیم دارند۔ ایزد جل و علا بر جمیع کساں رحم خود فرماید۔''

دوسرے روز عدالت نے حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم سنایا۔ خط مذکور میں اس کا ذکر اس طرح ہے:

''برادر من تا دہ عشرہ بسبب عدم ہمرسی حامل ایں لفافہ افتادہ ماند۔ حالیہ آدمی خاص مقرر کردہ فرستادہ می شد کہ جواب شافی باید۔ و حال پر ملال جناب مولوی (فضل حق) صاحب از لکھنو دریں عرصہ نوشتہ آمد۔ لائق گریستن و وایلا کردن است۔ یعنی حبس دوام از پیش گاہ حکم صادر یافت۔ فواویلا و واحسرتا۔ اوتعالیٰ رحم فرماید۔''

محررہ بستم فروری مطابق ۱۷ ؍رجب ۱۲۷۵ھ

(سیر العلماء)

آخرش جزیرۂ انڈمان روانہ کر دیے گئے۔ ادھر مولانا عبدالحق اور مولوی شمس الحق نے علامہ کے قریبی عزیز خان بہادر مفتی انعام اللہ خاں شہابی گوپاموی کے داماد خواجہ غلام غوث خاں بہادر ذوالقدر میر منشی لفٹیننٹ مغربی و شمالی کی معاونت سے اپیل دائر کر دی۔

مرزا غالب، یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

''مولانا (فضل حق) کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا۔ کچھ مجھ سے تم معلوم کرو۔ مرافعہ حکم دوام حبس بحال رہا بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے؟ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اِنا لِلّٰہ و انا الیه راجعون۔

میاں داد خاں سیاح، سیر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے تو مرزا غالب نے انھیں لکھا:

''ہاں خاں صاحب! آپ جو کلکتہ پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی؟ وہاں جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے؟ گذارہ کس طرح ہوتا ہے۔'' (اردوئے معلیٰ)

علامہ جزیرۂ انڈمان پہنچے۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی صدر امین بریلی وکول، مفتی مظہر کریم دریابادی اور دوسرے مجاہد علما وہاں پہلے پہنچ چکے تھے۔ ان علما کی برکت سے یہ بدنام جزیرہ دار العلوم بن گیا۔ ان حضرات نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ وہاں بھی قائم رکھا۔ خرابیِ آب و ہوا، تکالیف شاقہ، اور جدائیِ احبا و اعزہ کے باوجود علمی مشاغل جاری رہے۔

مفتی (عنایت احمد) صاحب نے ''علم الصیغہ'' جیسی صَرف کی مفید کتاب جو آج تک داخل نصاب ہے وہیں لکھی۔ سرکاری ڈاکٹر حکیم امیر خاں کی فرمائش سے ''تواریخ حبیب الٰہ'' (۱۲۷۵ھ) بھی تالیف کی۔ (یہی تاریخی نام بھی ہیں)

ان دونوں کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کے سینے علم کے سفینے بن گئے تھے۔ تاریخی یادداشت، ترتیبِ واقعات، قواعد فنون، ضوابط علوم سبھی حیرت انگیز کرشمے دکھا رہے ہیں۔ ایک انگریز کی فرمائش پر ''تقویم البلدان'' کا ترجمہ کیا جو دو برس میں ختم ہوا۔ اور وہی رہائی کا سبب بنا۔

واپسیِ ہندوستان پر شاگرد رشید مفتی لطف اللہ علی گڑھی نے تاریخ لکھ کر پیش کی:

چو بفضل خالقِ ارض و سما ۔۔۔ اوستادم شدز قیدِ غم رہا
بہرِ تاریخ خلاصِ آں جناب ۔۔۔ ہم نوشتم "اِنّ استاذی نجا"

۱۲۷۷ھ

(استاذ العلما مؤلفہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی)

مفتی مظہر کریم دریابادی نے میجر جان ہاٹن بہادر کمشنر جزائر دریائے شور کی فرمائش پر ''مراصد الاطلاع'' کا ترجمہ کیا۔ سید اسماعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی نے پانچ اشعار میں تاریخ لکھی۔ آخری شعر یہ ہے:

منیرؔ اس کی کہی تاریخ یوں سال مسیحی میں
یہی سیرِ جدیدِ بوستان ہفت کشور ہے
۱۸۶۶ء

(کلیات منیرؔ شکوہ آبادی)

علامہ فضل حق نے بھی کئی مفید تصانیف لکھیں۔ انھیں میں ''الثورۃ الہندیہ'' اور ''قصائد فتنۃ الہند'' ہیں۔ یہ رسالہ اور قصائد جہاں تاریخی ہیں وہیں عربی ادبیت کے بھی شاہکار ہیں۔ علامہ کا کمال یہ ہے کہ اشعار اور جملوں میں ایک مادّہ کے مختلف صیغے متعدد معنوں میں بے تکلف استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔ نظم ونثر دونوں اصناف میں اس کا ظہور برابر نظر آتا ہے۔ مثال کے لئے حسب ذیل عبارت و اشعار کافی ہیں۔

یہ رسالہ مع قصائد علامہ نے مفتی عنایت احمد کاکوروی کے ذریعہ ۱۲۷۷ھ میں خلف الصدق مولانا عبدالحق خیر آبادی کے پاس بھیجا تھا کہ ابن میاں کو جا کر یہ تحفہ دے دینا۔ پنسل اور کوئلہ سے لکھے ہوئے مختلف پرچے تھے جن کو کئی ماہ کی محنت کے بعد مولانا عبدالحق درست و مرتب کر پائے تھے:

الحمد للہ عظیم الرجاء☆ للانجاء من دون الارجاء☆ من البلویٰ و البلیٰ و البلاء☆ وابلاء حسن البلاء☆ بایتاء الآلاء☆ لمن دعاہ باسنی الاسماء☆ لاسیما لمن ظلم و اضطر عندالابتلاء☆ بالاسواء و الادواء☆

ما ناح اورق فی اوراق اشجان   اِلا وھیج اشجانی و اشجانی
دائی عضال ولایجدی لعائدۃ   عود لداء لعود الداء بموّاد

علامہ اوران کے ساتھیوں کو کیا تکالیف اٹھانی پڑیں اور انڈمان میں کیسے ذلت آمیز برتاؤ سے سابقہ رہا، رسالہ وقصائد میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔

سپرنٹنڈنٹ ایک شریف انگریز تھا۔ مشرقی علوم سے واقف اور فن ہیئت کا بڑا ماہر تھا۔ اس کی پیشی میں ایک سزایافتہ مولوی بھی تھے۔ اپنی ایک فارسی کی کتاب ہیئت ان کو دی کہ اس کی عبارت صحیح و درست کردیں۔ مولوی صاحب سے تو کام نہ چلا۔ علامہ نئے نئے گئے تھے ایک سال ہی گذرا تھا۔ ان کی خدمت میں وہ کتاب پیش کرکے تصحیح کی گذارش کی۔ علامہ نے نہ صرف عبارت درست کی بلکہ مباحث میں بہت کچھ اضافہ کرکے حاشیہ پر بہت سی کتب کے حوالے لکھ دیئے۔ جب یہ کتاب وہ مولوی صاحب سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گئے وہ دیکھ کر حیران وششدر رہ گیا۔ کہنے لگا مولوی صاحب! ''تم بڑا لائق آدمی ہے مگر جن کتابوں کے حوالے ہیں اور ان کی جو عبارتیں نقل کی ہیں یہاں کہاں ہیں؟''

مولوی صاحب مسکرائے اور اصل واقعہ علامہ کا کہہ سنایا۔ وہ اسی وقت مولوی صاحب کو لے کر بیرک میں آیا۔ علامہ موجود نہ تھے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد دیکھا کہ خستہ حالت میں چلے آرہے ہیں۔ وہ یہ ہیئت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ معذرت کے بعد کلرکی میں لے لیا۔ گورنمنٹ میں سفارش بھی کی۔ ادھر علامہ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بےخبر میر منشی لیفٹیننٹ مغربی وشمالی صوبہ اودھ سرگرم سعی تھے۔ مولوی شمس الحق انڈمان روانہ ہوگئے۔ وہاں جہاز سے اتر کے شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا۔ اس کے ساتھ بڑی تعداد میں لوگ تھے:

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲؍صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو علامہ فضل حق خیرآبادی کا انتقال ہوگیا ہے۔ اب سپرد خاک کرنے جارہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت ویاس شریک دفن ہوئے۔ اور بےنَیلِ مَرام واپس لوٹے:

قسمت کی بدنصیبی! کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

افسوس! ہمیشہ کے لئے یہ آفتاب علم وعمل دیارِ غربت میں غروب ہوگیا۔ اب تک یہ مزار زیارت گاہ خاص وعام ہے۔ اور آج بھی قبر بزبان حال کہہ رہی ہے:

تلك آثارنا تدل علینا فانظروا بعدنا الی الآثار

علامہ کی قبر انڈمان کے ساؤتھ پوائنٹ (جسے عرف عام میں نمک بھٹہ کہتے ہیں) ایک بستی

میں ہے جس کا ایک سمندری کنارہ Ross جزیرہ سے قریب ہے۔ یہ وہ جزیرہ ہے جہاں علما وغیرہ کو جہاز سے اتارا جاتا تھا۔ علامہ کی قبر کے ساتھ مولوی لیاقت علی کی بھی قبر ہے جن کا ذکر تواریخ عجیب از جعفر تھانیسری میں ہے۔ اور غدر کے چند علما از مفتی انتظام اللہ شہابی میں ہے۔

مزار کے متعلق مندرجہٗ ذیل مکتوب (15/6/1974) قابل توجہ ہے:

محترم جناب شیروانی صاحب — خدمت میں آداب

یہ خط آپ کی خدمت میں جناب سلیم اللہ صاحب کے توسط سے ارسال کر رہا ہوں امید ہے کہ اس خط کو پڑھ کر آپ محظوظ ہوں گے۔ یوں تو میں آپ کے لئے انجان ہو سکتا ہوں لیکن آپ میرے لئے قطعی انجان نہیں۔ آپ سے غائبانہ تعارف لٹن لائبریری (علی گڑھ) کے زمانے سے ہی ہے۔ بد قسمتی میری کہ ذاتی طور پر آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ آپ کی کتاب ''باغی ہندوستان'' کو خرید کر پڑھنے کا شرف حاصل رہا۔ اور علمائے دین کا رشتہ انڈمان کی سرزمین اور باشندوں سے جان کر از حد مسرت ہوئی۔

کاش کہ پرانے لوگ بھی بہ حیات ہوتے تو آج آپ کے اس حوالہ کا جو عربی میں ہے اور جو علامہ فضل حق سے نسبت ہے کہ:

تلك آثارنا، تدل علينا
فانظروا بعدنا الى الآثار

اس کی تصدیق بھی ہو جاتی۔ تاہم اپنی کوششوں سے کچھ تحقیق کے بعد اور آپ کی تحریر کی امداد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس مزار میں جو دو مقبرے ہیں ان میں سے پہلا فضل حق مرحوم کا ہے اور دوسرا مرحوم لیاقت علی صاحب کا ہے۔

مولوی لیاقت علی کا تذکرہ دو جگہوں سے دستیاب ہو سکا۔ لیکن بہت ہی مختصر جو نا کافی ہے۔ رسالہ ''آج کل'' کا جنگ آزادی نمبر جس میں نثار احمد فاروقی صاحب کا ایک مضمون ہے۔ جنرل بخت خاں کے عنوان سے

انھوں نے حضرت خواجہ حسن نظامی کی کتاب ''بہادر شاہ کا مقدمہ'' سے اقتباس لیا ہے۔ دوسرا مولوی جعفر تھانیسری صاحب کی اپنی خودنوشت سوانح حیات ''کالا پانی'' اور ''تواریخ عجیب'' میں ہے۔ میں نے لٹن لائبریری میں دوران طالب علمی دیکھی تھی۔ اب تو یہ کتاب جمیعۃ العلما کے جنرل سکریٹری آل انڈیا تعلیمی بورڈ جناب وحیدالدین قاسمی صاحب نے دوبارہ شائع کروا کر محترم خان بادشاہ عبدالغفار خاں کو ہندوستان آنے پر جمیعۃ کی طرف سے بطور ہدیہ پیش کش کی ہے۔

افسوس کہ دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں کے یہاں قابض ہو جانے اور ان کی بالا دستیوں کی وجہ سے تمام پرانے ریکارڈ خاکستر ہو چکے ہیں۔ اور تحقیق کے لئے کوئی کاغذ اور کارآمد ثبوت نہیں ملتے۔ میں نے بھی انگریزی میں ایک مقالہ:

Two Targetten India Mufuy At Port Blair.

کے عنوان سے لکھا ہے۔

اس مقصد سے کہ دعویٰ اور غلط قیاس آرائیاں جواب تک اس مزار سے متعلق جو مرجع تھا وہ نئی صورت سے نئی تحقیق کی روشنی میں آجائے اور عوام الناس کو اس کی صحیح نوعیت کا پتہ چلے۔ زیادہ تر باتیں تو آپ کی کتاب ''باغی ہندوستان'' سے ہی ماخوذ ہیں۔ کاش کہ اور تفاصیل مل جاتیں۔ یہاں تو ایسی کوئی لائبریری بھی نہیں کہ جس سے استفادہ کیا جاتا اور سرکاری ذرائع بھی خاموش ہیں۔ البتہ علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری، یا پھر دہلی آرکائیز Archives میں کچھ مزید باتیں شاید مل جائیں۔ اب میں زیادہ دقت نہیں لوں گا۔

جناب سلیم اللہ صاحب بھی اتفاق سے تشریف لے آئے تھے۔ اور مجھے آپ سے ملنے کے بعد یہ شرف رہا کہ ایک صبح میں آپ کو اس مزار کی زیارت کے لئے لے گیا۔ خراماں، خراماں سمندر کے کنارے ٹہلتے ہوئے ساؤتھ پوائنٹ جو عرف عام میں نمک بھٹہ کہلاتا ہے زیارت کے

لئے پہنچے۔ یہ مزار ساؤتھ پوائنٹ کی ایسی بستی میں واقع ہے جس کا ایک سمندری کنارہ Ross جزیرہ سے قریب ہے۔ یہ وہی جزیرہ ہے جہاں پر اول اول مولویانِ طریقت جہاز سے لاکر اتارے جاتے تھے۔ ان میں سے بہت سے علما کا تذکرہ تواریخ عجیب میں مولوی جعفر تھانیسری مرحوم نے کیا ہے۔

سلیم اللہ صاحب کل جہاز سے روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ میرے لئے باعث فخر ہے کہ آپ چند دن ساتھ رہے اور ہمیں اچھی اچھی باتوں سے نوازتے رہے۔ باقی آئندہ۔ خدا حافظ۔ نیاز مند سید شوکت علی (اپوزٹ نیتا جی کلب ہال، نزد جامع مسجد، پورٹ بلیئر، انڈمان، آئرلینڈ)

مولانا عبداللہ بلگرامی (شاگرد علامہ فضل حق) لکھتے ہیں:

"فادرج الفضل فی اثناء اکفانه و دفن العلم باند فانه"
(مقدمہ ھدیہ سعیدیہ)

فضل ان کے کفن میں مکفون اور علم ان کے ساتھ مدفون ہو گیا۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"تبحر فی العلوم العقلية و النقلية، و فاق على المهرة الكملة بالنفس القدسية حتى امتلأت الآفاق بصيت كماله، و شحنت الاقطار بفضله وجلاله. و كان الغالب عليه من العلوم المعقول، و من المنقولات العلوم الادبية و الكلام و الاصول، اما المعقولات فرزق فيها نفسها قدسية و ملكة ملكوتية، كان يرى الطالبين نظرياتها ببينانه الصافى كالمحسوسات المرئية، و اما ارتجاله بالخطب و الاشعار العربية مع التجنيس و الاشتقاق و حسن البراعة و الطباق، و غيرها من الصنائع الادبية، فلم يخلق مثله فى البلاد، و لم يأت عديله فيما افاد و اجاد." (مقدمہ ھدیہ سعیدیہ)

ترجمہ: علوم عقلیہ ونقلیہ کے متبحر اور ماہرین کاملین پر نفس قدسیہ کے باعث فائق تھے۔ آپ کے کمال کی شہرت سارے زمانے میں پہنچی ہوئی تھی۔ اور آپ کے فضل وکمال سے سارا آفاق گونج رہا تھا۔ علوم میں فن معقول کا غلبہ تھا اور منقولات میں ادب، کلام، اور اصول پر توجہ خاص تھی۔ معقولات میں نفس قدسیہ اور ملکۂ ملکوتیہ حاصل تھا۔ طلبہ ان کے بیان صافی کی وجہ سے نظریاتِ معقولات کو بالکل محسوس ومرئی پاتے تھے۔ خطبات و اشعار فی البدیہہ فرماتے تھے۔ تمام صنائع ادبیہ تجنیس، اشتقاق، حسن براعت اور صنعت طباق کا ارتجال کے باوجود پورا پورا مظاہرہ ہوتا تھا۔ انھیں کمالات کے پیش نظر اپنے علم وفضل میں بے نظیر اور افادہ وحسن تلقین میں بے عدیل تھے۔''

مصائب کا خاتمہ علامہ کی ذات ہی پر نہیں ہوجاتا۔ اولاد واحفاد کو بھی پریشانیوں کا سامنا رہا۔ سب سے بڑی مصیبت ضبطیِ جائداد واملاک کی تھی۔ علامہ بڑے امیر کبیر تھے۔ دولت دنیا و دین دونوں سے بہرہ ور اور صاحب عز ووقار تھے۔ حکّام وقت، شاہزادگان عالی تبار، امراء ورؤساء اور صلحاء سبھی عزت کرتے تھے۔ شاہانہ زندگی گذاری۔ ہاتھی، گھوڑے، پالکی، فینس، اور دوسری شان وشوکت کی سواریاں ہر وقت دروازے پر موجود رہتیں۔ جب مولانا عبدالحق پیدا ہوئے تو دہلی کے خواص وعوام اور برادران وطن نے بھی بطور اظہارِ خوشی نذرانے اور تحفے لاکھوں روپیہ کے پیش کیے۔ (حسرۃ العلما بوفاۃ شمس العلما مؤلفہ مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی)

تحدیث بالنعمۃ کے طور پر خود علامہ نے قصیدہ ہمزیہ میں اپنی ترفہ وفراغت کا ذکر فرمایا ہے:

کانت بفضل الحق فضل مثالۃ   منھا علی الامثال لی استعلاء

ووجاھۃ بین الوجوہ وجاھۃ   تعنو لھا الاعیان و الرؤساء

و براعۃ و رفاعۃ و رفاھۃ   و نزاھۃ و نباھۃ و علاء

جرمِ بغاوت ثابت ہوجانے پر خیرآباد کا سنگین وعالیشان دیوان خانہ اور محل سرا ضبط کرکے بہ صلۂ خیرخواہی سردار محمد ہاشم شیعی سیتاپوری (مورث اعلیٰ آغا فتح شاہ مشہور پلیڈر سیتاپور) کو دے دیے گئے۔ انھوں نے رئیس کمال پور ضلع سیتاپور راجہ جواہر سنگھ کے ہاتھ پانچ سات ہزار میں

کوڑیوں کے مول فروخت کر ڈالے۔ عرصۂ دراز تک راجہ جواہر سنگھ اور ان کے بعد ان کے بیٹے راجہ سورج بخش سنگھ نے اپنی جگہ پر قائم رکھے۔

مولوی حکیم ظفر الحق بن مولانا اسد الحق بن مولانا عبدالحق خیر آبادی فرماتے ہیں کہ خود راجہ مذکور نے مجھ سے کہا کہ صرف علامہ کی یادگار میں میں نے اسے محفوظ رکھا ہے۔ جب بارش کی کثرت اور غیر آباد حالت میں پڑے رہنے سے آثار شکست و ریخت نمودار ہونے لگے تو ایک انجینئر کو درستی کے لئے بھیجا۔ تخمینۂ درستی، تیس پینتیس ہزار روپیہ بتایا تو راجہ نے مجبوراً پتھر کھدوا کر کمال پور منگوا لیے۔ اور کچھ سامان حکیم سید انوار حسین خیر آبادی مشہور طبیب و معالج خاص تعلقداران اودھ کو دے دیا۔ دروازہ بطور یادگار باقی رہنے دیا۔ جو آج بھی صاحب مکان کی عظمت و جلالت کا مرثیہ زبان حال سے پڑھ رہا ہے اور دیکھنے والوں کے لئے عبرت و موعظت کا سامان مہیا کر رہا ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

یہ مکان موسومہ ''نیا محل'' (جو ۱۹۶۶ء میں منہدم ہو چکا ہے) منشی نیاز احمد فاروقی بانی مدرسہ نیازیہ و رئیس خیر آباد کے مکان کی نقل تھا۔ فرق اتنا تھا کہ اس میں دو تہ خانے تھے۔ اور منشی صاحب کے مکان میں ایک ہے۔ آگرہ وغیرہ سے پتھر منگوائے گئے تھے۔ تقریباً بیس سال ہوئے جب یہ مکان کھدوایا گیا تھا۔ مولانا حکیم احمد علی صاحب خیر آبادی فرماتے ہیں کہ علامہ کا کتب خانہ بھی ضبط کر لیا گیا تھا۔

جب خلف الرشید مولانا عبدالحق خیر آبادی کو دلداری کے پیش نظر ۱۶ر فروری ۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن گورنر جنرل ہند کے دستخط سے سند خطاب ''شمس العلما'' بلا کسی طلب و کوشش کے ملی تو علامہ کے ضبط شدہ دیہات میں سے کچھ دیہات بھی واپس دیئے جانے کا حکم دیا گیا۔ مولانا فرمایا کرتے تھے! باپ کو کالا پانی کیا اور بیٹے کی خطاب سے اشک شوئی کی۔

مولانا عبدالحق خیر آبادی رام پور میں تھے۔ خیر آباد کے ایک باشندے یار علی نے علامہ فضل حق خیر آبادی کا بیٹا بن کر وہ دیہات قبضے میں لے لیے۔ ''اندھیر نگری چوپٹ راج'' کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا مل سکے گی؟ مولانا عبدالحق نے عذر داری وغیرہ کسر شان سمجھ کر خاموشی اختیار فرمائی۔ بعد میں یار علی نے مصلحتاً یہ دیہات بیچ ڈالے۔

ان میں سے ایک موضع زین پور ہے جو حضرت مولانا شاہ سید محمد اسلم خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشیں آستانہ حافظیہ المتوفی ۱۳۲۰ھ نے ایک ہزار میں خرید کر اپنے پیر و مرشد حافظ سید محمد علی شاہ خلیفۂ حضرت شاہ محمد سلیمان تونسوی کے مصارفِ درگاہ کے لئے وقف کر دیا۔ جس کا انتظام سجادہ نشینان درگاہ کرتے رہے ہیں۔ حافظ سید امتیاز حسین سجادہ نشین کے انتقال کے بعد اب میاں سید ماجد حسین حال سجادہ نشین اس کا انتظام کرتے ہیں۔ دوسرا موضع نندو پوروہ لالہ نندو لال نے ایک ہزار میں خریدا۔ اس طرح علامہ کے اخلاف پریشانِ روزگار رہے۔

علامہ فضل حق خیر آبادی کی اس خاندانی شاہانہ زندگی کے ساتھ جب انقلاب ۱۸۵۷ء کے روح فرسا اور صبر آزما حالات کے پیش آنے کا تصور ہوتا ہے تو موصوف کی شخصیت، استقلال، ثباتِ قدم اور مجاہدانہ عزم کا اندازہ ہوتا ہے۔ خصوصاً جب اس زمانہ کے عیش و راحت میں پلنے والے ''مجاہدوں'' پر نظر پڑتی ہے تو علامہ کا مرتبہ کتنا بلند ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کی صد سالہ مکمل غلامی میں کتنی مرتبہ مسلمانوں پر مصائب و شدائد کے پہاڑ توڑے گئے۔ اسی حکومت برطانیہ کے ہاتھوں سرزمین حجاز و شام و مصر کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے۔ اسی کے ہاتھوں ٹرکی کا مردِ بیمار گرفتارِ آزار ہوا۔

اسی نے قبلۂ اول بیت المقدس (فلسطین) جیسے پاکستان کو ناپاکستان بنانے کی تجویز کی۔ اسی کی بدولت ترکی و عرب کے مسلمانوں پر ہندوستانی فوجوں نے گولیاں چلائیں۔ موپلہ قوم کی بربادی کی ذمہ دار بھی یہی بدنام حکومت تھی۔ انڈونیشیا (جاوا) اور وزیرستان پر بمباری و فوج کشی کرنے والی یہی سلطنت تھی۔ دولتِ عثمانیہ کی چادر کو ٹکڑے ٹکڑے اسی دولتِ برطانیہ نے کیا تھا۔

ان تمام دردناک مصائب کے باوجود ہندوستان کا یہ مسلمان عیش پرست و جاہ پسند طبقۂ امرا خوابِ راحت میں سوتا رہا۔ سوتا ہی رہتا تو بھی زیادہ شکوہ نہ تھا۔ جاگا اور مسلمانان ہند و مقاماتِ مقدسہ کے سینوں کو چھلنی کرانے کے لئے رنگروٹوں کی بھرتی کرائی۔ حیثیت سے زیادہ چندے دے دیئے۔ وفاداری کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔ بڑے بڑے عہدے اور خطابات حاصل کیے۔ انعامی جاگیریں پائیں۔ مختصر یہ کہ وہ سب کچھ کیا جو نہ کرنا چاہیے تھا۔ اور وہ کچھ نہ کیا جو کرنا چاہیے تھا۔

آج جب کہ حکومت برطانیہ کا رختِ سفر بندھ چکا۔ پرِ پرواز تُل چکے۔ بین الاقوامی حالات

اور ملکی تحریکات نے اسے سب کچھ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو اس درندہ صفت، انسان نما گروہ نے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی یعنی خطابات کی واپسی کو جہاد سے تعبیر کرنا شروع کیا۔ اور بغلیں بجا بجا کر اپنی بہادری کا ڈنکا پیٹنے لگے۔ حالاں کہ دنیا جانتی ہے کہ یہ انسانی لباس میں درندے اور بھیڑ کی کھال میں بھیڑیے ہیں۔ ملک وقوم کے غدّاروں اور مذہب وملت کے منافقانِ سرمدی ہیں۔

من جرّب المجرب حلّت به الندامة.

آزمائے ہوئے کو آزمانے سے آخر میں شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے۔

علامہ فضل حق کی سیاسی بصیرت اور فطری فہم وفراست کا اندازہ الثورة الهندیہ کی تمہیدی عبارت کے بعد آنے والی عبارت سے لگائیے جس کی ابتدا من قصتها کے جملہ سے شروع ہوتی ہے۔ علامہ نے اس میں بتایا ہے کہ ہندوستان پر تسلط کے بعد انگریز بقاء سلطنت کے لئے دو اسکیموں پر عمل کرنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

اول: یہ کہ پچھلے زمانہ کے علوم ومعارف اور مدارس ومکاتب مٹانے کے بعد اسکولوں کی یکساں تعلیم کا رواج جس سے ہر مذہب وملت کے افراد ایک ہی رنگ میں رنگ جائیں۔

دوم: یہ کہ غلّہ پر کنٹرول کر کے خدا کی مخلوق کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا جائے۔

علامہ لکھتے ہیں:

"انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر فرقوں کا اختلاف، تسلط وقبضہ کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوگا۔ اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا۔ اس لئے پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ مذہب وملت کے مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکر وحیلہ سے کام لینا شروع کیا۔ انھوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی تعلیم اور اپنی زبان و مذہب کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے۔ پچھلے زمانہ کے علوم ومعارف اور مدارس ومکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔

دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقات پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمین ہند کے غلہ کی پیداوار کاشتکاروں سے لے کر نقد دام ادا کیے

جائیں۔اوران غریبوں کوخرید وفروخت کا کوئی اختیار نہ چھوڑا جائے۔اس طرح نرخ گھٹانے، بڑھانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔اس کا مقصداس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کی مخلوق، مجبور و معذور ہوکر ان کے قدموں میں آپڑے۔اور خوراک وغیرہ نہ ملنے پران کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔

پہلی اسکیم کے متعلق لارڈ میکالے کے یہ جملے کافی سند ہیں:

''ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جوہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو۔اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جوخون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہومگر مذاق اور رائے، زبان اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔''

دوسری اسکیم پر جب عمل ہوا ہو یا نہ ہوا ہولیکن اس چار سالہ زمانۂ جنگ (عظیم) کے کنٹرول عمل درآمد نے باشندگانِ ہند کی آنکھیں کھول دی ہیں۔غلّہ کا ملنا دشوار، کنٹرول کی دکانوں سے لینے میں عزت وآبرواور وقت عزیز کی بربادی، شہر میں ذراسی گڑبڑ پر دکانوں اور گوداموں کی قفل بندی، ان سب مصیبتوں کا مستقل ہر کہ ومہ کوسامنا رہا ہے۔

۱۱ر جولائی ۱۹۴۶ء سے پوسٹ مینوں اور کم تنخواہ والے ملازمین پوسٹ آفس کی جائز احتجاجی ہڑتال پر راشن کی سہولتیں چھین لینے کی مرکزی حکومت کی طرف سے دھمکی نے علامہ کے بیان کو بالکل سچ کردکھایا۔

کیا سچا ارشاد ہے سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا:

اتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنورِ الله۔

مومن کی فراست سے ڈرتے رہو۔یہ اللہ کے نور سے سب کچھ دیکھ اور سمجھ لیتا ہے۔

کہاں ہیں اس قول کے قائل کہ ''مولوی کو سیاست نہیں آتی''؟ آئیں۔ اور رسالہ الثورة الہندیہ پڑھیں۔

مولوی کی سیات غلام دماغ نہیں سمجھ سکتا۔انگریز سمجھتا ہے سوچو اور غور کرو۔

۹۰ رسال قبل سارے دفاتر پر اسی طبقہ کا قبضہ تھا۔ علما و مشاہیر وقت سرکاری و شاہی محکموں پر قابض تھے۔

مولانا فضل امام خیر آبادی صدر الصدور دہلی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مفتی عنایت احمد کاکوروی مصنف وصدر امین کول و بریلی، مولوی فضل رسول بدایونی سررشتہ دار کلکٹری صدر دفتر سہسوان، مفتی انعام اللہ گوپاموی قاضی دہلی وسرکاری وکیل الہ آباد۔ مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی سررشتہ دار صدر امین بریلی، علامہ فضل حق خیر آبادی سررشتہ دار ریزیڈنسی دہلی وصدر الصدور لکھنؤ و مہتمم حضور تحصیل اودھ، مولوی غلام قادر گوپاموی ناظر سررشتہ دار عدالت دیوانی وتحصیلدار گوڑگاواں، مولوی قاضی فیض اللہ کشمیری سررشتہ دار صدر الصدور دہلی وغیرہم۔ یہ سب اپنے وقت کے بے نظیر وعدیم المثال اکابر علما تھے۔ حکومت کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمانوں کی سلطنت کی بربادی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ موقع کا انتظار تھا۔ ۱۸۵۷ء کا وقت آیا تو سب میں پیش پیش یہی حضرات تھے۔

والیانِ ریاست وارا کینِ دولت میں ناقوس حریت پھونکنے والے یہی تھے۔ عوام کو ابھارنا اور فتوئ جہاد جاری کرنا انھیں کا کام تھا۔ اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے زیادہ مصائب اٹھانے والے اور آتشِ حریت میں جلنے والے یہی شمع شبستان آزادی کے پروانے تھے۔

انگریز نے ان کو جانا اور پہچانا۔ ایک ایک کر کے تمام عہدوں سے اس طبقہ کہ سبکدوش اور اس گروہ کے خلاف پورا محاذ قائم کیا۔ اپنی ایک مخصوص جماعت چھوڑی جس کا سب سے بڑا مقصد علما کی تذلیل وتوہین، ان کو سیاست سے نابلد بتا کر اور دقیانوسیت کا الزام لگا کر قوم کی زمامِ قیادت پر قبضہ کرنا تھا۔

اے کاش! مسلمان قوم سوچتی کہ وہ انگریز کی صد سالہ اسکیم کو اس پردے میں عملی جامہ پہنا رہی ہے۔ وہ اپنے مجاہدین وسرفروش علما کی توہین وتذلیل ان سرکاری ایجنٹوں کے اشاروں پر نادانستگی سے نہیں کر رہی ہے بلکہ اپنے پاؤں میں اپنے ہی ہاتھوں سے کلھاڑی مار رہی ہے۔

ہمیں نیک شگون بیت المقدس پر قبضۂ نصاریٰ سے ملتا ہے۔ ۱۰۹۹ء سے ۱۱۸۷ء تک ۸۸

سال تسلط رہا۔ جس میں ظلم وتعدی کی انتہا ہو چکی تھی۔ آخر سلطان صلاح الدین ایوبی نے پرچم اسلام لہرایا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۵ء تک بھی ۸۸ سال ہی ہوتے ہیں۔ مظالم ومصائب کا یہاں بھی خاتمہ ہو چکا ہے۔ پہلی شملہ کانفرنس ۱۹۴۵ء میں ہی حکومت برطانیہ ہتھیار ڈال چکی تھی۔ دوسری شملہ کانفرنس ۱۹۴۶ء میں اسے شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔

یہ بھی حسنِ اتفاق تھا کہ ۲۷/رجب ۵۸۳ھ کو مسجد اقصائے بیت المقدس میں سلطان نے نماز شکر ادا کی۔۔ جب کہ اسی تاریخ میں سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے شب معراج میں اسی مقام پر امامتِ انبیا فرمائی تھی۔ اسی طرح یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ یروشلم کی طرح، ہندوستان بھی اسی قوم کے ہاتھوں سے اسی مدت میں آزاد ہو رہا ہے۔ (ملخص۔ ص ۲۱۲ تا ۲۳۷۔ باغی ہندوستان مؤلفہ مولانا عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی۔ طبع چہارم المجمع الاسلامی مبارک پور۔۔ ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء)

☆☆☆☆☆☆☆☆

فتوائے جہاد اور قائدانہ کردار

راجہ غلام محمد (لاہور)

علامہ فضل حق خیر آبادی کے فتوائے جہاد کی صدائے بازگشت سناتا ہوں:

''علما نے جس جس طرح بغاوت کو منظم کیا، اس کو مفصل بیان کرنے کے لئے تو ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے مگر ان کا کچھ تذکرہ ان صفحات پر کیا جارہا ہے۔ اس حقیقت سے بڑے بڑے مؤرخ بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکے ہیں کہ یہ علما عوام میں بے حد مقبول تھے۔ ان کی تحریر و تقریر کا بڑا اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ دہلی میں جنرل بخت خاں کی تحریک پر مولانا فضل حق خیر آبادی اور دوسرے علماے نے جو جہاد کا فتویٰ دیا، اس کے بارے میں مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے بھی اپنی تاریخ میں اقرار کیا ہے کہ اس سے مذہبی جوش و خروش بہت بڑھ گیا تھا۔''

(ص ۴۵۵۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء۔ از خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مکتبہ برہان دہلی ۱۹۵۹ء)

''مولانا (فضل حق خیر آبادی) کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی لوگوں نے جہاد کا پرچم بلند کر رکھا تھا۔ مولانا پہنچے تو مسلمانوں کو جنگ آزادی پر آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہوا جس پر علماے دہلی کے دستخط لیے گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور انھوں نے علما کے نام تجویز کیے، جن پر دستخط لیے گئے۔''

(۱۸۵۷ء کے مجاہد۔ از غلام رسول مہر، ص ۲۰۶۔ کتاب منزل لاہور۔ ۱۹۶۰ء)

پاکستان کے نامور شاعر ناصر کاظمی اور مشہور کالم نویس انتظار حسین کی ادارت میں شائع

ہونے والے مجلّہ ''خیال'' کے سن ستاون نمبر میں شکور احسن صاحب مفتی صدرالدین آزردہ پر مضمون لکھتے ہوئے علامہ کے فتوائے جہاد کا ذکر کرتے ہیں:

''جب برطانوی استعمار کے خلاف ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو بعض شاعروں، ادیبوں اور عالموں نے اس میں سرگرمی سے حصہ لیا اور انگریزی حکومت کا اقتدار بحال ہو جانے کے بعد ان پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ گئے۔ مولانا فضل حق کو جہاد کا فتویٰ صادر کرنے کے جرم میں انڈمان بھیجا گیا۔ صہبائی کو پھانسی کے تختہ پر لٹکایا گیا۔ شیفتہ کو قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں۔''

(مجلّہ ''خیال'' لاہور، سن ستاون نمبر، ص ۲۶۸)

مفتی صدرالدین آزردہ ہی کے بیان میں مفتی انتظام اللہ شہابی فتویٰ جہاد کی تیاری کی ساری ذمہ داری مولانا فضل حق پر ڈالتے ہیں:

''ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں رونما ہوا۔ مولانا فضل حق الور سے دہلی آئے۔ جنرل بخت خان نے نقشۂ اقتدار جما رکھا تھا۔ استفتا مولانا نے لکھا۔ مفتی صاحب و دیگر علما نے فتویٰ دیا...... مولانا فضل حق کو اقرارِ جرم پر انڈمان جانا پڑا۔''

(غدر کے چند علما۔ از انتظام اللہ شہابی۔ ص ۴۸۔ دینی بکڈپو۔ دہلی)

رئیس احمد جعفری تمام عمر آزادی کی تحریک کی جزئیات کھنگالتے رہے۔ وہ اپنی ضخیم کتاب ''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد'' میں لکھتے ہیں:

''مولانا فضل حق خیر آبادی علمی قابلیت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان کو فتویٔ جہاد کی پاداش اور جرم بغاوت میں انڈمان بھیج دیا گیا۔''

(''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد'' از رئیس احمد جعفری، ص ۳۱۵۔ کتاب منزل لاہور۔ ۱۹۵۶ء)

محمد اسمٰعیل پانی پتی اپنے مضمون ''۱۸۵۷ء میں علمائے کرام کا حصہ'' میں مولانا فضل حق کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ عظیم دہلی میں رونما ہوا تو (علامہ فضل حق خیر آبادی) فوراً دہلی پہنچے اور جہاد کا فتویٰ دیا۔ جنرل بخت [illegible] انڈر ان

چیف افواجِ ظفر سے ملے اور اس کی بڑی اعانت اور امداد کی...... لکھنؤ میں ان پر مقدمہ قائم ہوا۔ نہایت بے باکی اور صفائی کے ساتھ بغیر ذرّہ بھر ہچکچاہٹ اور تذبذب کے اقرار کیا کہ ہاں! میں نے فتویٰ لکھا اور اس پر دستخط کیے اور جو کچھ میں نے کیا اپنے خیال میں ٹھیک کیا۔'' (ماہنامہ لیل و نہار لاہور۔ جنگِ آزادی نمبر ۱۸۵۷ء، ص ۲۸۔ ۱۲؍مئی ۱۹۵۷ء)

پاکستان کے مشہور جریدۂ تحقیق ''الزبیر'' کے تحریک آزادی نمبر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''مولانا فضل حق نے ایک دن بعدِ نماز جمعہ جامع مسجد میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ پڑھ کر سنایا تو بہتوں کے لئے باعثِ تشویش بنا۔ اس فتویٰ پر مفتی صدرالدین آزردہ اور دوسرے پانچ علما کے دستخط تھے۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ جد و جہد نے ایک نیا زور پکڑا اور جگہ جگہ انگریزوں کے چھکّے چھوٹ گئے......

تاریخ ذکاءاللہ کے مطابق اس فتویٰ کے بعد صرف دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی...... سرکاری وکیل کے مقابلے میں انھوں نے خود بحث کی اور سب الزام ایک ایک کر کے رد کردیئے۔ لیکن فتویٰ کے بارے میں آخر تک اڑے رہے کہ وہ فتویٰ صحیح ہے اور میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری رائے یہی ہے۔''

(سہ ماہی ''الزبیر'' بہاول پور، تحریک آزادی نمبر شمارہ ۱۹۷۰ء، ص ۹۲)

مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی ''علماے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں'' کے صفحہ ۵۶ پر لکھتے ہیں:

''دلاور جنگ مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی آگرہ سے لکھنؤ آئے۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے خلاف علما میں سرگرمیِ عمل پیدا کر رہے تھے۔ مولانا (فضل حق) بھی ان کے ہمنوا ہوگئے اور سرکاری ملازمت ترک کر کے الور چلے گئے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء رونما ہوا۔ دلّی آئے۔ بہادر شاہ سے ملے۔ یہاں جنرل بخت خان کے ٹھاٹ جمے ہوئے تھے۔

نصاریٰ کے خلاف جہاد کا فتویٰ مولانا نے دیا اور اس پر مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی وغیرہ کے دستخط کرائے گیے۔''

''جج کے سامنے آپ کی موجودگی میں سرکاری گواہ پیش ہوا۔ اس نے آپ کو دیکھا تو کہنے لگا ''یہ وہ فضل حق نہیں ہیں جنھوں نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا۔ وہ دوسرے ہیں۔''

آپ فوراً بول اٹھے ''پہلی اطلاع اس کی صحیح ہے اب غلط کہہ رہا ہے۔ مجھ پر جو جرم عائد کیا گیا ہے وہ درست ہے۔ میں نے ہی فتویٰ لکھا اور آج بھی میری رائے وہی ہے۔''

جج نے حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا تجویز کی جو بہ خندہ پیشانی قبول فرما کر انڈمان گئے۔''

یہی مفتی صاحب اپنی دوسری کتاب میں بھی علامہ کے فتویٰ کے حق میں فتویٰ دیتے ہیں:

''مولانا نے اپنے اوپر کے بقیہ الزام رد کرنے کے بعد پلٹا کھایا اور کہا کہ جس مخبر نے فتویٰ کی خبر کی اس کے بیان کی اب میں توثیق کرتا ہوں۔ میرا ہی لکھا ہوا ہے۔ اور میرے ہی مشورے سے علما نے دستخط کیے۔ پہلے اس گواہ نے سچ رپورٹ لکھوائی تھی مگر اب عدالت کے سامنے میری صورت سے مرعوب ہو کر جھوٹ بولا ہے۔ مجھے خدا کے حضور جانا ہے۔ غلط بات مذہب کے معاملے میں نہیں بول سکتا۔'' (''ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما'' از مفتی انتظام اللہ شہابی۔ ص ۵۳۔ دینی بکڈپو۔ دہلی)

مکتبہ برُہان دہلی کی شائع کردہ کتاب ''جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون'' از خورشید مصطفیٰ رضوی میں ہے:

''کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء قریب آنے پر آپ (فضل حق) نے اکثر والیانِ ریاست کو بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی آگئے اور یہاں جنرل بخت خان کی تحریک پر جہاد کا فتویٰ مرتب کر کے

پیش کیا۔ جس سے مسلمانوں میں بے حد جوش وخروش پیدا ہو گیا۔''
لکھنؤ میں مقدمہ چلا جس میں حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ مولانا بری ہو جائیں مگر آپ نے برسرِ عدالت کہہ دیا کہ ''میں نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور آج بھی میری وہی رائے ہے۔'' (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، ص ۵۸، ۴۵۷)

علامہ فضلِ حق کی کتاب ''الثورۃ الہندیہ'' کے اردو ترجمے کے مقدمہ میں لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اورنٹیلسٹ محمد عبدالشاہد خاں شیروانی لکھتے ہیں:

''اس رسالہ کو دیکھنے سے اس وقت کے خوفناک حالات کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور نصاریٰ کے خوفناک عزائم کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ہندوستان کی رعایا کے گلے میں دائمی غلامی اور نصرانیت کا پٹہ ڈالنے کی کوشش کی جارہی تھی اور علمائے مجاہدین کا ایسے مواقع پر اعلانِ جہاد کس قدر بروقت اور ضروری تھا۔

علامہ خیرآبادی کا رجب ۱۲۷۵ھ میں باطل قوتوں کے سامنے یہ اعلانِ حق ہمیشہ آبِ زر سے لکھا جاتا رہے گا کہ۔ ''وہ فتویٰ صحیح ہے'' میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔'' (مقدمہ ''باغی ہندوستان'' از محمد عبدالشاہد خاں شیروانی، مطبوعہ مکتبہ قادریہ، اندرون لوہاری دروازہ لاہور۔ طبع ثانی ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء)

پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی) لکھتے ہیں:

''دہلی میں بہادر شاہ ظفر نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ مولانا فضلِ حق خیرآبادی نیز دوسرے علما دہلی میں موجود تھے...... جنرل بخت خان کے مشورے سے علامہ فضل حق خیرآبادی نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں جہاد کی اہمیت وضرورت پر تقریر کی اور جہاد کا استفتا مرتب کر کے پیش کیا۔ جہاد کے فتویٰ کی تیاری میں جنرل بخت خان کی کوشش خاص تھی۔'' (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد! مولانا فیض احمد بدایونی۔ از محمد ایوب قادری،

ص ۲۲،۲۱۔ پاک اکیڈمی۔ کراچی ۱۹۵۷ء)

پاکستان کے مشہور محقق ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اپنے مضمون ''مولانا فضل حق خیرآبادی'' میں کہتے ہیں:

''مسلمانوں کو عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کے لئے آخری مرتبہ جان کی بازی لگا دینے پر آمادہ کرنے کے لئے ایک باقاعدہ فتویٰ جہاد کا جاری کیا گیا، جس پر دستخط کرنے والوں میں مفتی صدرالدین آزردہ اور مولوی فضل حق بھی شریک تھے۔

مولانا فضل حق نے فتویٰ کے بعد جگہ جگہ دورے کیے اور بالآخر دہلی پہنچ گئے۔ اس زمانے میں ان کی سیاسی سرگرمیوں کا اندازہ جیون لال کے روناپچے سے ہوتا ہے جس میں اس نے مختلف تاریخوں میں مولانا کا قلعے کی مجلس مشاورت میں شریک ہونا بیان کیا ہے۔ مولانا فضل حق کے مشورے صرف قلعۂ معلیٰ کی پوشیدہ مجلسوں تک محدود نہ تھے۔ وہ جنرل بخت خان سے ملے، مشورے ہوئے اور آخر میں بعد نماز جمعہ دلّی کی لال مسجد (جامع مسجد دہلی) میں علما کے سامنے تقریر کی اور فتویٰ پیش کیا۔''

(مجلّہ ''خیال'' لاہور، سن ستاون نمبر ص ۲۶۴۔۲۶۳)

پاکستان میں دیوبندی مکتبِ فکر کے آرگن ہفت روزہ ''خدام الدین'' لاہور کے ایک مضمون کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''برا ہو تاریخ کا۔ اس نے اپنے حافظہ سے ایسی ایسی جانباز، حق گو، بہادر اور جامعِ کمالات شخصیتوں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا، جنھوں نے اپنے دور میں وقت کے تیز و تند طوفانوں سے بے خوف و خطر ٹکر لی اور پیٹھ نہیں دکھائی۔ مولانا فضل حق رحمۃ اللہ علیہ تاریخ کے ان جواں مرد اور نڈر مجاہدین میں سے تھے جن کی جرأت و ہمت اور حق گوئی و بے باکی نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، مگر تاریخ کے صفحات میں ان کو شایانِ شان کیا، کوئی معمولی جگہ بھی نہیں مل سکی ......

مولانا فضلِ حق خیرآبادی نے افضل الجهاد کلمة حق عند سلطانٍ جائرٍ کا فریضہ ادا کیا اور اپنی عمرِ عزیز انڈمان میں حبس دوام کی نذر کردی......

علامہ فضل حق خیرآبادی وغیرہ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دے کر مسلمانوں کو عدم تعاون پر آمادہ کیا......

مولانا فضل حق بھی "باغی" قرار دیئے گئے۔ سلطنتِ مغلیہ کی وفاداری، فتویٔ جہاد کی پاداش یا جرمِ بغاوت میں مولانا ماخوذ کر کے سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔" (مضمون۔ "مولانا فضل حق خیرآبادی" از مستقیم احسن حامدی فاضل دارالعلوم دیوبند ہفت روزہ خدام الدین لاہور۔ ۲۳ر نومبر ۱۹۶۲ء۔ ص ۹،۱۰)

علامہ فضل حق خیرآبادی کی استقامت کا حال مولانا حسین احمد مدنی کی زبانی سنیے:

علامہ فضل حق اپنے فتویٔ جہاد پر مفتخر ہیں اور اس الزام سے براءت کے بجائے اس کی پاداش میں ہر سزا بھگتنے کے لئے ہمہ تن تیار:

"مولانا نے اپنے اوپر جس قدر الزام لیے تھے، ایک ایک کر کے سب رد کر دیئے۔ جس مخبر نے فتویٰ کی خبر کی تھی۔ اس کے بیان کی تصدیق و توثیق کی۔ فرمایا:

"پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔ اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور جھوٹ بولا۔ وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔"......

جج بار بار علامہ کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مخبر نے عدالت کا رُخ اور علامہ کی بارعب و پُروقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ ہی دیا تھا کہ یہ مولانا فضل حق نہیں وہ دوسرے تھے۔ گواہ حسنِ صورت اور پاکیزگیِ سیرت سے بے انتہا متاثر ہو چکا تھا مگر علامہ کی شانِ استقلال کے قربان جایئے۔ خدا کا شیر گرج کر کہتا ہے: "وہ فتویٰ صحیح ہے میرا لکھا ہوا ہے، اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے:"

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

شیر میسور سلطان ٹیپو کے رزم گاہِ شہادت کا یہ فقرہ کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ ''شیر کی ایک روزہ زندگی گیڈر کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''

علامہ کے اقرار و توثیق کے بعد گنجائش ہی کیا رہ گئی تھی؟ بے حد رنج کے ساتھ عدالت نے حبسِ دوام بعبور دریائے شور کا حکم سنایا۔ آپ نے کمال مسرت اور خندہ پیشانی سے سنا۔ (نقشِ حیات۔ جلد دوم۔ از حسین احمد مدنی، ص ۴۶۲)

مولانا حسین احمد مدنی صاحب اپنی دوسری کتاب ''تحریک ریشمی رومال'' میں پھر اس شیر حق کی شانِ استقلال پر قربان ہو رہے ہیں۔

''مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کو جو کہ تحریک کے بہت بڑے رکن تھے اور بریلی، علی گڑھ اور اس کے ملحقہ اضلاع کے دورانِ تحریک میں گورنر تھے، آخر ان کو گھر سے گرفتار کیا گیا۔ جس مخبر نے ان کو گرفتار کرایا تھا اس نے انکار کر دیا کہ مجھے معلوم نہیں، فتویٰ جہاد پر جس نے دستخط کیے ہیں وہ یہ فضل حق ہیں یا کوئی اور ہیں؟

......مولانا نے فرمایا: ''مخبر نے پہلے جو رپورٹ لکھوائی تھی وہ بالکل صحیح تھی کہ فتویٰ میرا ہے۔ اب میری شکل و صورت سے مرعوب ہو کر یہ جھوٹ بول رہا ہے۔''

قربان جایئے علامہ کی شان استقلال پر۔ خدا کا شیر گرج کر کہہ رہا ہے کہ میرا اب بھی وہی فیصلہ ہے کہ انگریز غاصب ہے اور اس کے خلاف جہاد کرنا فرض ہے۔

خدا کے بندے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ جان کی پروا کیے بغیر سر بکف ہو کر میدان میں نکلتے ہیں اور لومڑی کی طرح ہیر پھیر کر کے جان نہیں بچاتے بلکہ شیروں کی طرح جان دینے کو فخر سمجھتے ہیں۔''

(تحریک ریشمی رومال ۔ از حسین احمد مدنی۔ ص ۶۵،۶۴ ۔ مطبوعہ کلاسیک، لاہور۔ ۱۹۶۰ء)

''عدالت دو ججوں پر مشتمل تھی۔ جارج کیمبل جوڈیشیل کمشنر، اور میجر

بارن قائم مقام کمشنر خیر آباد ڈویژن۔ اس مشترکہ عدالت نے ۴؍ مارچ ۱۸۵۹ء کو اپنے فیصلے میں لکھا۔

بہر حال! عدالت کی نظر میں ثابت ہے کہ اس موقع پر ملزم نے بلا ضرورت مستعدی دکھاتے ہوئے صراحت سے ایسا فتویٰ دیا جس کا مقصد قتل کی ترغیب دینا تھا۔ اس نے قرآن کی آیات پڑھیں اور ان کے من مانے معنی کیے اور اصرار کیا کہ انگریزوں کے ملازم کافر و مرتد ہیں اس لئے شریعت کے نزدیک ان کی سزا قتل ہے۔ بلکہ اس نے باغی سردار سے یہاں تک کہا کہ تم انہیں قتل نہیں کرتے تو تم خدا کی نظر میں مجرم ہو۔'' (ماہنامہ ''تحریک'' دہلی۔ جون ۱۹۶۰ء۔ بحوالہ غالب نام آورم از نادم سیتاپوری۔ ص ۱۱۸، ۱۱۷۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۱۹۷۰ء)

رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:

''مذکورہ سطور میں ہم نے غدر کے جن ہیروؤں کا ذکر کیا ہے ان میں سے صرف بخت خان اور مولانا فضل حق خیر آبادی دو ایسی شخصیتیں ہیں جنھوں نے دہلی کے محاربات غدر میں مرکز نشیں ہو کر حصہ لیا ہے......

بخت خان اور مولانا فضل حق کے احوال و سوانح، واقعات و حوادث کارناموں اور سرگرمیوں کی تفاصیل معلوم کرنا آسان نہ تھا......غدر کے بعد غدر کا ذکر بھی کتنا روح فرسا تھا اور ان شخصیتوں کا تذکرہ جنھوں نے اس انقلابی تحریک میں مردانہ وار حصہ لیا تھا۔ اپنی جان سے ہاتھ دھونا تھا......

ان اکابر کا اوّل تو مرتب اور منضبط صورت میں کہیں ذکر نہیں ملتا اور اگر کہیں ملتا بھی ہے تو مخالفانہ اور معاندانہ انداز میں۔ ان مشکلات کے باوجود زیادہ سے زیادہ معتبر اور مستند مواد حاصل کرنے کی اپنے مقدور بھر ہم نے کوشش کی ہے۔ (بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد۔ ص ۸۳۴)

خونِ دل کو صَرفِ گلشن کر، مگر یہ سوچ کر
تیرے سر الزامِ تحریکِ خزاں بھی آئے گا

جناب حسین احمد مدنی مولانا فضلِ حق رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلامذہ اور ساتھیوں کے جہادِ حریت میں بڑے پیمانہ پر حصہ لینے کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ علامہ نے جنگ آزادی میں ہر طرح حصہ لیا، کیوں کہ وہ اخلاص کے ساتھ یہ یقین رکھتے تھے کہ انگریزوں کی غلامی ہماری ملّی زندگی کے لئے زہر قاتل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے لئے انھوں نے مقدور بھر اضطراب کا اظہار کیا اور انگریزوں کو زک پہنچانے کے لئے مختلف عملی اقدام کیے۔

> ''بہر حال! مسلمان علما میں سے مولانا احمد اللہ شاہ صاحب دلاور جنگ مدراسی اور مولانا فضلِ حق صاحب خیر آبادی اور مولوی امام بخش صہبائی، مفتی صدرالدین آزردہ صدر الصدور، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولوی عبدالقادر صاحب، مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رام پوری، مفتی عنایت احمد کاکوروی...... اور ان حضرات کے تلامیذ وغیرہ نے جہادِ حریّت ۱۸۵۷ء میں بڑے پیمانہ پر حصہ لیا تھا۔''
> (''نقشِ حیات'' حصہ دوم۔ص ۴۶۰۔از حسین احمد مدنی)

تحریک آزادی کی مشہور تاریخ نگار سیدہ انیس فاطمہ بریلوی علامہ فضل حق خیر آبادی کو طبقۂ علما کا سر گروہ قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''خواص میں جنرل بخت خان، فیروز شاہ، نانا راؤ، نواب تجمل حسین خان، جنرل محمود خاں اور عظیم اللہ خاں تھے اور علما کے سرگروہ مولوی احمد اللہ، مولوی لیاقت علی اور مولوی فضل حق خیر آبادی قرار پائے۔'' (۱۸۵۷ء کے ہیرو۔ص ۷۰۔اقبال بکڈپو، کراچی۔۱۹۵۶ء)

پروفیسر محمد ایوب قادری لکھنؤ میں علامہ کی سرگرمیوں کی تصدیق کر رہے ہیں:

> ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے حصہ لیا۔ دہلی میں جنگِ آزادی کے آخری مرحلے میں پہنچے۔ لکھنؤ میں بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔'' (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) از پروفیسر محمد ایوب قادری۔ص ۴۳۸۔پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۷۶ء)

ایک جریدے میں مولانا امداد صابری دہلوی نے انگریزی جاسوسوں کی رپورٹوں اور روزناموں وغیرہ کے حوالے سے دہلی کی جنگِ آزادی میں علامہ فضل حق کے فعال کردار پر روشنی ڈالنے کے بعد منشی ذکاءاللہ دہلوی کی کتاب کا ذکر بھی کیا ہے:

''یہ تو محبِ وطن حضرات کے مخبروں، جاسوسوں اور دشمنوں کی رپورٹوں اور روزناموں میں اپنے انداز میں مولانا فضل حق نے ۱۸۵۷ء کی دہلی کی جنگِ آزادی میں جو حصہ لیا تھا، اس کے بارے میں رائے ہے......
منشی ذکاء اللہ صاحب نے اپنی مشہور تصنیف ''تاریخِ عروجِ سلطنتِ انگلشیہ ہند'' میں مولانا فضل حق خیرآبادی کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ جو انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انجام دی تھیں اور ان کی پاداش میں ان کو جلاوطن ہونا پڑا۔''

(جامعہ'' دہلی، نومبر ۱۹۶۲ء مضمون امداد صابری، ص ۲۶۸)

اس صفحے پر ہی لکھتے ہیں:

''یہ بات تو مسلمہ ہے کہ مولانا فضل حق خیرآبادی نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا۔''

جنرل بخت خان مجاہدینِ جنگِ آزادی کے سربراہ تھے۔ لکھنؤ میں بیگم حضرت محل نے حریت کا پرچم اٹھایا تھا اور علامہ فضل حق دونوں جگہوں پر ان دونوں کے معتمد تھے اور ان کی کارروائیوں میں شریک رہے۔

''جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا (فضل حق) نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خان کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ جب انگریزوں کو فتح ہوئی تو گرفتار ہوئے۔''

(علم وعمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد اول مترجم مولوی معین الدین افضل گڑھی ص ۲۵۶۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ۱۹۶۰ء)

''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خان کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا بعبور دریائے شور کی سزا

ہوئی۔" (تذکرہ علمائے ہند از مولوی رحمٰن علی۔ ص ۳۸۳)

محمد ایوب قادری صاحب نے اپنی کتاب میں مولانا فضل حق کے بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر ہونے کا اور اپنے ایک مضمون میں جنرل بخت خان کی مشاورت میں بھی ان کے شریک ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ پھر وہ علامہ کے قصائد اور ان کی کتاب کو جنگِ آزادی کا "نہایت قابل قدر مآخذ" قرار دیتے ہیں۔

"جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خان کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی......

انڈمان ونکوبار کے زمانۂ قیام میں علامہ خیرآبادی کی دو چیزیں یادگار ہیں — "الثورۃ الھندیہ" اور "قصائد فتنۃ الہند" یہ دونوں چیزیں تاریخی ہونے کے علاوہ ادب کا بھی شاہکار ہیں...... یہ رسالہ اور قصیدہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات کے نہایت قابلِ قدر مآخذ ہیں۔"

(مقالہ "جزائر انڈمان ونکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات" از محمد ایوب قادری، سہ ماہی "اُردو" کراچی۔ جنوری ۱۹۶۸ء ص ۶۲)

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ" مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی کے صفحہ ۹۶، ۹۷ اور ۱۶۲، ۱۶۳ پر بتایا ہے:

"جب زمانہ میں شور وشر پھیلا تو مولوی فضل حق خیرآبادی نے دہلی کا عزم کیا اور (بادشاہ کی) بارگاہ میں باریابی کے آرزومند ہوئے اور نذر اور نثار کے لئے بہت سا روپیہ پیش کیا"۔

روزنامچے میں ان کی جلالتِ علمی کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

"مولوی فضل حق نے مختلف علوم میں خاص مرتبہ حاصل کیا تھا۔ یقیناً فنِ منطق میں ان کا علمی سرمایہ اجتہاد کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا۔"

مولانا فضل حق کی دربار شاہ میں مصروفیت کے بارے میں منشی جیون لال اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے:

''۱۶/ اگست ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق شریکِ دربار ہوئے۔ انھوں نے اشرفی نذر پیش کی اور صورت حال کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔

۱۸/ اگست ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ انگریزی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ شہر پر قبضہ ہو جانے کے بعد باشندوں کا قتلِ عام کیا جائے گا۔

۶/ ستمبر ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے۔''

(علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد چہارم۔ ۱۸۵۷ء اور جانبازانِ حریت، از سید محمد میاں۔ ص ۴۹۴۔ الجمعیۃ بکڈپو۔ دہلی)

مشہور مؤرخ رئیس احمد جعفری علامہ کی دوسری مصروفیات کے علاوہ والیانِ ریاست اور امرائے ہند کو جنگِ آزادی میں شامل کرنے کی کوششوں کا ذکر یوں کرتے ہیں: (قارئین کرام اس سے پہلے خورشید مصطفیٰ رضوی کی کتاب کا اقتباس ملاحظہ کر چکے ہیں)۔

''وہ (فضل حق خیر آبادی) انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور انگریزوں کو نکالنے کے لئے ہر منظم اور باقاعدہ تحریک میں حصہ لینے پر دل و جان سے آمادہ رہتے تھے۔ چنانچہ غدر جب شروع ہوا تو مولانا بے تأمل اس میں شریک ہوئے۔

وہ بہادر شاہ کے معتمد، مقرب اور مشیر تھے۔ ان کے دربار میں شریک ہوا کرتے تھے۔ انہیں اہم معاملات و مسائل پر مشورے دیتے تھے اور اس بات کے ساعی تھے کہ آزادی کی یہ تحریک کامیاب ہو اور انگریز اس دیس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائیں۔

مولانا نے غدر میں دلیری اور جرأت کے ساتھ علانیہ حصہ لیا۔ انھوں نے متعدد والیانِ ریاست اور امرائے ہند کو اس تحریک میں شامل کرنے کی کوشش کی، جس جس والی ریاست سے ان کے ذاتی تعلقات و مراسم تھے۔'' (بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد۔ ص ۸۹۲۔ کتاب منزل لاہور ۱۹۵۶ء)

علامہ فضل حق بہادر شاہ ظفر سے مشورے کرتے ہیں۔فوجی تنظیم کا جائزہ لیتے ہیں۔آزادی کے لئے کام کرنے والوں سے مستقل رابطہ رکھتے ہیں اور پھر اس جدوجہد میں سردار کے مشیر ہیں۔

''دہلی پہنچتے ہی سیدھے قلعے میں گئے اور بہادر شاہ ظفر سے ملاقات کی۔ جنگ کی صورتِ حال کے متعلق گفتگو کی۔ فوجوں کا جائزہ لیا۔آزادی حاصل کرنے کے لئے جو لوگ کمر کس چکے تھے ان سے ملے اور پھر روہیلوں کے سردار جنرل بخت خان کے پاس گئے......

۱۸۵۹ء میں مولانا فضل حق خیرآبادی کو مغلیہ حکومت کی وفاداری اور انگریزوں کے خلاف بغاوت میں شریک ہونے کے جُرم میں گرفتار کرلیا گیا۔'' (آزادی کے مجاہد از محمود الرحمٰن۔ص ۳۵۔نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی۔۱۹۷۳ء)

پروفیسر محمد ایوب قادری کا ایک مضمون ''مولانا فضل حق خیرآبادی کو انگریزی لباس اور طرز سے نفرت تھی''۔روزنامہ ''حریت'' کراچی میں چھپا ہے۔جس میں انھوں نے علامہ فضل حق کے دہلی سے بعد از خرابیِ بسیار اودھ پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔

''۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں مولانا فضل حق الور سے دہلی پہنچے اور دہلی سے بعد از خرابیِ بسیار اودھ پہنچے۔ بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر ہوئے۔ بعد ازاں مولانا فضلِ حق گرفتار ہوئے۔ بغاوت کے جرم میں اس یگانۂ روزگار شخصیت پر مقدمہ چلا۔'' (روزنامہ ''حریت''، کراچی، ۹؍ جولائی ۱۹۷۷ء)

حامد حسن قادری ان کے ''جُرمِ بغاوت'' کے متعلق لکھتے ہیں:

''۱۸۵۹ء میں جب غدر کے بعد انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو اور لوگوں کے ساتھ مولانا فضل حق پر بھی جرمِ بغاوت عائد کیا گیا اور حبسِ دوام بعبور دریائے شور کا حکم ہوا۔'' داستانِ تاریخِ اردو۔ص ۳۲۹)

علامہ پر قائم کردہ مقدمے کی رپورٹ میں لکھا ہے:

''یہ بات ان ایام میں عام طور پر مشہور تھی کہ چند آدمی بیگم (حضرت محل)

کے مشیرانِ خاص ہیں۔ باغی فوج میں ان کی ''اربعہ شوریٰ'' کے نام سے شہرت تھی، بلکہ کبھی کبھی انہیں ''کچہری پارلیمنٹ'' کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ اس شوریٰ میں ملزم (فضل حق) بہت ممتاز تھا۔''

فیصلے میں یہ بھی لکھا ہے:

''وہ خطرناک ترین آدمی ہے جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس لئے انصاف اور امن عامہ کا تقاضا ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے۔''

جوڈیشنل کمشنر اودھ اور قائم مقام کمشنر خیر آباد ڈویژن نے ۴/مارچ ۱۸۵۹ء کو فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا:

''بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے دیدہ دانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بہ قدم چلتا رہا۔ ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنا چاہیے اور اسے خاص طور سے ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیے۔'' (ماہنامہ ''تحریک'' دہلی، جون ۱۹۶۰ء۔ بحوالہ حرفِ آغاز ''باغی ہندوستان'' از محمد عبدالحکیم شرف قادری۔ مطبوعہ، مکتبہ قادریہ، اندرون لوہاری دروازہ لاہور۔ ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء)

سید مصطفیٰ علی بریلوی جنگ آزادی کے عظیم رہنماؤں کی فہرست میں مولانا فضل حق کا ذکر یوں کرتے ہیں:

ہماری پہلی جنگِ آزادی کے ہیرو بلاشبہ انگریزی فوجی اور سول افسران سے کسی طرح قابلیت اور حب الوطنی میں کم نہیں تھے۔ جنرل بخت خان، جنرل محمود خان، بیگم حضرت محل، مولانا احمد اللہ شاہ، سید لیاقت علی، مولانا فضل حق، خان بہادر خاں، نانا راؤ، تانتیا ٹوپی، شہزادہ فیروز شاہ، جھانسی کی رانی، محمد علی خان عرف جیمی گرین وغیرہ مجاہدین کے لیڈر تھے اور اپنی اپنی جگہ بڑی بڑی خوبیوں کے لوگ تھے۔'' (مضمون ''جنگ آزادی کی کہانی، انگریزوں کی زبانی'' ماہنامہ ترجمانِ اہل سنت کراچی۔ جنگِ آزادی نمبر۔ ص ۱۰۵۔ شمارہ جولائی ۱۹۷۵ء)

دہلی کے اس دور کا ایک اخبار نویس چُنی لال ۱۹ر مئی ۱۸۵۷ء کو یہ خبر دیتا ہے:

''علمائے دین نے تمام شہر کے مسلمانوں کو جمع کر کے انگریزوں سے جہاد کرنے کی ترغیب دی اور کہا کہ کفار کو قتل کرنے سے اجر عظیم ملتا ہے۔ ہزاروں مسلمان ان کے علَم کے نیچے جمع ہو گئے۔'' (''بہادر شاہ'' کا مقدمہ۔ ص ۱۱۷)

اس قسم کے متعدد جلسے ان علما نے مسجدوں خصوصاً جامع مسجد دہلی میں کیے اور ان میں مولانا فضل حق خیر آبادی اپنی پُر جوش تقریروں سے مسلمانوں میں جوش جہاد پیدا کرتے رہے۔ چنانچہ یہی چُنی لال لکھتا ہے:

''مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔''

(اخبار دہلی، از چُنی لال، ص ۲۷۳، فائل ۱۲۷۔ بحوالہ ''فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون'' از حکیم محمود احمد برکاتی۔ ص ۴۸۔ مطبوعہ برکات اکیڈمی، لیاقت آباد، کراچی۔ ۱۹۷۵ء)

اودھ کے چیف کمشنر کا سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری کے نام ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو ایک سرکاری مراسلے میں لکھتا ہے:

''مندرجہ ذیل لوگوں کے چلے جانے کے بعد حکومت کو قیام امن میں کافی سہولت ہو رہی ہے۔ فیروز شاہ، لکڑ شاہ، مولوی فضل حق جو ہماری حکومت کا دشمنِ جاں ہے، حالاں کہ حکومت نے اسے اور اس کے اعزہ کو اعلیٰ مناصب عطا کیے تھے۔'' (فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون۔ ص ۸۸، ۸۷۔ مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی)

بہادر شاہ ظفر سے علامہ فضل حق کی ملاقاتوں کا مقصد جنگ آزادی کو تیز تر کرنا تھا۔ انھوں نے بادشاہ کو فعال کرنے کی کوشش کی۔ مجاہدین کی سرپرستی کی اہمیت جتائی اور دوسرے مناسب مشورے دیئے:

''......ان حالات میں تحریک کی کامیابی کے امکانات کا دھندلا جانا لازمی ہے۔ مولانا نے اس اہم مسئلے پر پہلے دن سے توجہ دی اور بہادر شاہ سے اپنی پہلی ملاقات میں اس پر زور دیا کہ مجاہدین کی روپیہ اور سامانِ رسد سے مدد کرنا نہایت ضروری ہے۔

حکیم احسن اللہ خاں نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب جب بھی بادشاہ سے

ملتے، بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جنگ کے سلسلے میں رعایا کی ہمت افزائی کریں اور ان کے ساتھ باہر (محاذ پر) نکلیں اور دستوں کو جس حد تک ممکن ہو، بہتر معاوضہ دیں۔" (میموریز۔ ص ۲۴، ۲۳۔ فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون، ص ۵۰، ۴۹)

علامہ فضل حق نے صرف بہادر شاہ اور بخت خان سے ملنے اور انہیں مشورہ دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ شاہ نے جو "کنگ کونسل" تشکیل دی تھی۔ علامہ اس کے بھی بڑے اہم رُکن تھے۔

"سید مبارک شاہ (جو دوران غدر دہلی کا کوتوال رہا تھا) کا بیان ہے کہ بہادر شاہ نے جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضل حق پر مشتمل ایک کنگ کونسل تشکیل دی تھی۔ مبارک شاہ ہی نے ایک جگہ اس کو "پریوی کونسل" بھی لکھا ہے۔"

The Great Revolution of 1857

(از ڈاکٹر سید معین الحق (کراچی)۔ ص ۱۲۸۔ ۱۸۳)

سوویت یونین کی سائنس اکیڈمی کے ادارۂ علوم شرقیہ کی ایک ممتاز رکن مادام پولونسکایا ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

"مولانا (فضل حق) الور تشریف لائے جہاں انھوں نے انگریزوں کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پرچار کیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ زمیندار جو برطانوی حکومت سے مطمئن نہیں ہیں، اس کی بنیادی طاقت ہوں گے۔

مولانا موصوف کے معاصرین اور ان کے سوانح نگاروں نے ان کے بہت سے خطوط کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کو لکھے تھے۔ انھوں نے برطانیہ کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پیغام دیا تھا۔ بغاوت کے زمانے میں مولانا انگریزوں کے مخالفوں کی صف میں رہے......

مولانا فضل حق خیر آبادی کے سماجی اور سیاسی نظریات سامراجی محکومی کے جوئے سے ملک کو آزاد کرنے کی اس خواہش کے آئینہ دار تھے جو پوری قوم

کے سینے میں پروان چڑھ رہی تھی۔ اس حیثیت سے ان کی جملہ سرگرمیاں ہندوستان کے قومی مفاد کو پورا کرتی تھیں۔'' (پندرہ روزہ ''سوویت دیس'' دہلی۔ ۱۰؍جولائی ۱۹۵۸ء)

ڈاکٹر مہدی حسین لکھتے ہیں:

''اگر جیون لال کے بیان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے تو مولوی فضل حق نے شاہی فوج کی کمان بھی کی ہے۔'' (بہادر شاہ دوم۔ ص ۳۹۱۔ بحوالہ فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون۔ ص ۵۲، ۵۱۔ مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۵ء)

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانِ صحرا نوشتہ ایم

(ملخص۔ ص ۲۶ تا ص ۵۰۔ امتیاز حق مؤلفہ راجہ غلام محمد لاہوری۔ طبع پنجم المجمع الاسلامی مبارک پور ۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۴ء۔ طبع اول مکتبہ قادریہ لاہور ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء)

☆☆☆☆☆☆☆

مقدمہ بغاوت کے نتائج واثرات اور اس کے متعلقات

مولانا محمد عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی

ڈاکٹر اطہر عباس رضوی جب ''سوتنتر دہلی'' تالیف کر رہے تھے تو اس کی ترتیب کے سلسلے میں سرکاری مواد بھی مہیا کر رہے تھے۔ اسی ضمن میں علامہ فضل حق خیر آبادی کے مقدمہ کی مسل بھی میسر آ گئی۔ موصوف سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں۔ وہ غالباً ۱۹۴۴ء میں کتاب خانہ حبیب گنج (علی گڑھ) میں اپنے موضوع کی تحقیق کے سلسلے میں پہنچے تھے اور میں وہاں کام کرتا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۴۵ء میں لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) میں بہ حیثیت اورینٹل اسسٹنٹ میرا تقرر ہو گیا۔ کچھ دن کے بعد رضوی صاحب بھی شعبۂ تاریخ میں لیکچرر ہو کر آ گئے۔ پھر تو مسلسل ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ یوپی سرکار میں اچھے عہدے پر چلے گئے۔ اسی دور میں ''سوتنتر دہلی'' کی تالیف کی۔ اب آسٹریلیا کی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور وہیں کے باشندے ہو گئے ہیں۔ مگر تقریباً ہر سال علی گڑھ آتے ہیں۔

میری استدعا پر موصوف نے اس مسل کی دو کاپیاں ٹائپ کر کے مجھے دیں۔ پھر میری استدعا پر اس کا اردو ترجمہ بھی کر کے دیا۔

اس مسل میں سے کچھ کاغذات سرکاری طور پر نکال لیے گئے ہیں۔

علامہ کو ۳۰ر جنوری ۱۸۵۹ء کو گرفتار کیا گیا اور لکھنؤ میں مقدمہ چلایا گیا۔ گرفتاری سے تین

ہفتے کے اندر کیپٹن ایف۔اے۔وی تھربرن کی عدالت میں ۲۱/فروری ۱۸۵۹ء کو مقدمہ شروع ہوا۔استغاثہ اور صفائی کے پانچ پانچ گواہوں کے بیانات کے بعد ۲۸/فروری ۱۸۵۹ء کپتان وی تھربرن نے فرد جرم مرتب کر کے مقدمہ جوڈیشیل کمشنر اودھ کی عدالت میں منتقل کر دیا۔جوڈیشیل کمشنر مسٹر جارج کیمبل اور میجر بارو قائم مقام کمشنر خیر آباد ڈویژن کی مشترکہ عدالت سے ۴/مارچ ۱۸۵۹ء کو قتل پر انگیخت اور بغاوت کے الزام میں بطور شاہی قیدی حبس حیات جبس بعبور دریائے شور اور تمام جائداد کی ضبطی کی سزا سنا دی گئی۔

مقدمہ فوجداری نمبر ۲ (۱۷) ۱۸۵۹ء خیر آباد ڈویژن۔

سرکار: بنام فضل حق

الزام: بغاوت

سزا: عمر قید و ضبطی کل جائداد۔

---

(۱) مسٹر تھامسن کا نیم سرکاری خط مورخہ ۹/فروری۔

(۲) کیپٹن وی تھربرن کے ریکارڈ کی شہادت۔

(۳) مقدمہ فوجداری کیپٹن تھربرن کی عدالت میں چلا۔

(۴) چارج شیٹ

(۵) کلینڈ

(۶) اخبار کا ترجمہ۔مورخہ ۱۶/جون ۱۸۵۸ء

(۷)

(۸) خط از طرف کمشنر مسلیح اسٹیٹ نمبر ۷ (۱۷) مورخہ ۲/مارچ۔

(۹) فارسی اخبار کے اقتباسات۔

(۱۰) نقل خط از طرف کمشنر سی،ایس،ایس نمبر ۷، مورخہ ۲/مارچ ۱۸۵۹ء بنام کمشنر دہلی۔

(۱۱) کمشنر دہلی کا خط نمبر ۱۳۵ (۱۷) مورخہ ۲۶/فروری ۱۸۵۹ء (جس کے ساتھ ایک نوٹ بزبان فارسی نوشتہ فضل حق جس پر G لکھا ہے منسلک ہے)

(۱۲)

(۱۳) اور مختلف لوگوں کے Deposition بزبان فارسی۔

(۱۴) جوڈیشل کمشنر کے شہادتی نوٹ۔

(۱۵) چارج شیٹ۔

(۱۶) ریمارکس مع ڈاکٹ نمبر ۳۲۲ مورخہ ۷؍مارچ ۱۸۵۹ء بنام الیس۔

(۱۷) وارنٹ نمبر ۱۴۔

(۱۸) مولوی فضل حق کی جانب سے عرض داشت (Petition) بزبان فارسی۔

(۱۹) خط از طرف کمشنر خیر آباد نمبر ۱۵۳ مورخہ ۳۰؍جولائی۔

(۲۰) خط بنام Zeazlal کمشنر نمبر ۴۸۰ مورخہ ۱۲؍اگست ۱۸۶۱ء۔

(۲۱) خط از طرف Zeazlal کمشنر نمبر ۱۹۷۵۔ مورخہ ۱۲؍اگست ۱۸۶۱ء

(۲۲) نقل ایک G. ایجنٹ کے روبکار ایٹ راجپوتانہ کی مورخہ ۱۰؍جولائی ۱۸۶۱ء۔

(۲۳) مسٹر ولیم کا میمو۔

(۲۴) خط بنام ایجنٹ گورنمنٹ جنرل راجپوتانہ نمبر ۵۱۷ مورخہ ۱۶؍از طرف سپرنٹنڈنٹ پورٹ بلیر (۲۵ اور ۲۶)

(۲۵) Arydak (گم ہے۔ ممکن ہے الگ کر دیا گیا ہو۔ نمبر A مورخہ ۱۱۔۴۔۱۸۹۰ء)

سب سوائے نمبر ۲۔۴۔۱۴۔۱۵۔۱۶۔۱۹۔۲۰۔۲۱ اور ۲۶ کے الگ کر دیئے گئے۔

(۲۶) وارنٹ

(۲۷) فارسی کی مسل لسٹ پر نشانی لگائی ہوئی۔

(۲۸)

(۲۹)

(۳۰) (۳۱) ڈسٹرکٹ جج کے کاغذ نمبری ۲۵۸۵ مورخہ ۱۷؍دسمبر ۱۸۹۱ء۔

(۳۲) (۳۳) جوڈیشل کمشنر کے کاغذ نمبری آر۔۱۷۔۱۸۵۹ء مورخہ ۲۴؍دسمبر ۱۸۹۱ء۔

یہ مقدمۂ فوجداری نمبری ۲ (۱۷) کیپٹن ایف۔اے۔وی تھربرن کی عدالت میں ۲۱؍فروری ۱۸۵۹ء کو لکھنؤ میں شروع ہوا۔ استغاثہ کی طرف سے پانچ گواہ پیش ہوئے۔ (۱) عبدالحکیم

اکسٹرا اسسٹنٹ دریاباد (۲) تجمل حسین (۳) فضل حسین (۴) رام دیال (۵) مرتضیٰ حسین۔

ان گواہوں نے اپنے بیانات میں مولانا فضل حق کو بوندی میں ممو خاں باغی کا مشیر، اودھ کی بغاوت میں شریک کار، اور عبدالحکیم و مرتضیٰ حسین کے قتل کے لئے فتویٰ دینے کا مرتکب ثابت کرنے کی کوشش کی۔

استغاثہ کے گواہوں کے بعد مولانا فضل حق کا بیان ہوا:۔

بیان مدعا علیہ

''میں الور کے راجہ کی ملازمت میں تھا۔ میں ان کے ساتھ ۵ سال رہا۔ اور بغاوت کے شروع ہونے پر بھی ان کے ساتھ تھا۔ راجہ بنی سنگھ کی موت کے ایک ماہ بعد تک میں الور میں رہا۔ اگست ۱۸۵۷ء میں، میں نے الور چھوڑ دیا۔ میں نے دہلی کے لئے کوچ کیا۔ وہاں ۱۵ دن رہا۔ اور پھر الور لوٹ آیا۔ میں نے اپنا خاندان الور ہی میں رہنے دیا تھا۔ اور ستمبر ۱۸۵۷ء میں خیر آباد کے لئے چل پڑا۔ میں اپنے گھر رہا تھا۔ اور میں نے کسی کی ملازمت نہیں کی۔ نہ ہی میں باغیوں سے ملا تھا۔ میرے گواہان میر فتح حسین، محمد حسین اور احمد علی خاں ہیں۔ نبی بخش، قادر بخش، امام علی، آل محمد اور ممو خاں میرے رہنے سہنے کی شہادت دے سکتے ہیں۔ میں نے خیر آباد اس لئے چھوڑا کیوں کہ سب ہی لوگ بیگم کے ساتھ بھاگ لیے تھے۔ میں خیر آباد سے ہٹنے کے بعد کچھ وقفہ کے لئے کھیری۔ ہر گاؤں، تنبول اور سہور پور میں بھی ٹھہرا تھا۔ میں کچھ دن دوریہ میں بھی رہا۔ ۲۶؍ دسمبر ۱۸۵۸ء کو میں کرنل کلارک سے سیبہا کے مقام پر ملا۔ اس سے پہلے میں بریگیڈیر ٹروپ سے مل چکا تھا۔ بریگیڈ ٹروپ ہی نے مجھے کرنل کے پاس بھیجا تھا۔ کرنل کلارک نے ایک روبکار لکھی اور حکم دیا کہ اسے ڈپٹی کمشنر ضلع کی تحویل میں دے دیا جائے۔ میں ۳۰؍ دسمبر کو ڈپٹی کمشنر کے سامنے پہنچا پھر اپنے مکان پر رہا۔ ۳۰؍ جنوری ۱۸۵۹ء کو ڈپٹی کمشنر نے مجھے بلایا اور لکھنؤ بھیج دیا۔

فضل حق ایک دوسرے شخص کا نام ہے۔ اس کے بدلے میں مجھے گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ آج کل فیروز شاہ کے ساتھ ہے۔ وہ آنولہ کا تحصیلدار تھا۔ اور خان بہادر خاں اور بیگم کی ملازمت میں تھا۔ وہ سید ہے اور شاہجہاں پور کا رہنے والا ہے۔''

....

مولانا کے بیان کے بعد ۵ گواہانِ صفائی قادر بخش، نبی بخش، علی محمد خاں، ممّو خاں اور احمد علی خاں کے بیانات ہوئے۔ جن میں قیام خیرآباد اور باغیوں سے بے تعلقی پر زور دیا گیا تھا۔ اور مولانا پر قائم کیے گئے الزامات کو دوسرے فضل حق شاہجہاں پوری سے متعلق بتایا گیا تھا۔

کیپٹن ایف۔اے۔وی تھر برن نے استغاثہ، ملزم اور گواہان صفائی کے بیانات کے بعد ۲۸/فروری ۱۸۵۹ء کو حسب ذیل فرد جرم مرتب کر کے مقدمہ جوڈیشل کمشنر اودھ کی عدالت میں منتقل کر دیا۔

فرد جرم بغاوت

نکتہ: (۱) ملزم نے بوندی میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں باغی ممّو خاں کی کونسل میں حصہ لیا۔ اس طرح باغیوں کا خود بھی سردار رہا۔ اور بغاوت پر لوگوں کو آمادہ کرتا رہا۔

نکتہ: (۲) بوندی میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں جب کہ ممو خاں کے مشیر کی حیثیت سے کام کیا تو سازشِ قتل کی۔ عبدالحکیم جو سرکاری ملازم تھا اس کے قتل کا مشورہ دیا۔

....

وضاحت: ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کو مئی ۱۸۵۸ء میں باغیوں نے گرفتار کر کے بیگم اور ممو خاں کے پاس بھیجا۔ جو ان دنوں قلعہ بوندی اور اس کے گرد ونواح میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ عبدالحکیم کے ساتھ ہی ایک اور شخص مرتضیٰ حسین بھی گرفتار ہوا تھا جو اگر چہ سرکاری ملازم تو نہیں تھا لیکن انگریزوں کا وفادار تھا۔ اس لئے باغیوں میں مبغوض تھا۔ جب یہ دونوں، ممو خاں کے سامنے پیش ہوئے تو ملزم نے جو وہاں موجود تھا قرآن کی آیتیں پڑھیں۔ اور یہ رائے ظاہر کی کہ یہ دونوں موت کے مستحق ہیں۔ شہادت سے ثابت ہے کہ ملزم کا ممو خاں پر بہت اثر تھا۔ ملزم، اس کا مشیر باغی فوج میں گویا سرغنہ تھا۔ اس نے اپنے اثر ورسوخ کو عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین کے خلاف استعمال کیا۔ گو کہ یہ دونوں قید سے رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر یہ ممکن نہ تھا۔ اگر ممو خاں نے ملزم کو مولوی احمد اللہ شاہ کی جائداد ضبط کرنے کو نہ بھیجا ہوتا۔

لکھنؤ

۲۸-۲-۱۸۵۹ء

....

بعدالت لکھنؤ مورخہ ۱، ۲، ۴، مارچ ۱۸۵۹ء

بہ اجلاس لیفٹننٹ جی کیمبل جوڈیشل کمشنر آف اودھ و میجر بیرو۔ سی۔ ایم آر اوفشٹنگ کمشنر آف خیرآباد ڈویژن۔

مولوی فضل حق پر مندرجہ ذیل الزامات عائد کیے گئے۔

بغاوت اور قتل کی سازش

نکتہ: (۱) ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں باغی سرکار کی حیثیت میں دہلی، اودھ اور دوسری جگہوں پر بغاوت اور قتل میں مدد دی۔

نکتہ: (۱) بوندی میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں باغی سردار مموخاں کے مشیر خاص کی حیثیت سے نمایاں کام انجام دیا۔

نکتہ: (۳) بوندی میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں ملازم عبدالحکیم سرکار انگلشیہ کے خلاف سازشِ قتل کی۔قیدی نے خود کو مجرم نہیں مانا۔مقدمہ کی کارروائی ہوئی۔

عدالت نے قیدی کو مندرجہ ذیل وجوہ پر مجرم قرار دیا

(۱) ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں بغاوت کی سازش کی۔اور ایسے اصولوں کی اشاعت کی جس سے قتل کے امکانات پیدا ہوئے۔

(۲) بوندی میں ۱۸۵۸ء میں باغیوں کی کونسل میں خاص کام انجام دیئے۔خاص طور پر باغی سردار مموخاں کے مشیر خاص کی حیثیت سے اس نے ایسے اصولوں کی اشاعت کی، جس سے قتل کے امکانات پیدا ہوئے۔

۴/ مارچ کو مجرم کو عمر قید بعبور دریائے شور بحیثیت قیدی سرکار انگلشیہ اور ضبطیِ جائداد کی سزا دی گئی۔لکھنؤ ۴/ مارچ ۱۸۵۹ء

تشریح

اس شخص (فضل حق) کے مقدمہ کو دو حصوں میں منقسم کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔یہ شخص ۱۸۵۸ء میں باغی سردار کے مشیر خاص کی حیثیت سے مانا جاتا تھا۔دہلی میں اس کے تعلقات

تھے۔ دہلی کے کمشنر کے خط کے ذریعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تقریباً وہی رویہ وہاں بھی رکھا تھا۔ اس مقدمے کا جہاں تک دہلی سے تعلق ہے وہ ثابت نہیں کیا جاسکا۔ کیوں کہ گواہیاں نہیں پیش کی جاسکیں۔ اور مجرم کو اس بات کا موقعہ نہیں ملا کہ وہ الزامات کو قبول کر سکے یا انھیں جھٹلا سکے۔ مگر چوں کہ اس شخص کے خلاف اودھ کے الزامات ثابت کیے جاچکے ہیں۔ اس لئے اس کا رویہ دہلی میں بھی کم وبیش اسی قسم کا اخذ کیا جاسکتا ہے۔

مندرجہ ذیل الزامات اس ملزم پر عائد کیے گئے:

(۱) پوری بغاوت کے دوران اس شخص نے عام طور پر لوگوں کو اکسایا؛ اور

(۲) خاص طور پر اودھ میں ۱۸۵۸ء میں لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کیا۔

پہلے کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عدالت کے لئے ملزم کو قتل کے لئے اکسانے کے الزام پر سزا دینا ممکن نہ ہوگا۔ کیوں کہ جن لوگوں کے لئے یہ کہا جاتا تھا کہ ملزم نے انھیں قتل کرانے کی کوشش کی۔ وہ واقعۃً قتل نہیں کیے گئے۔ اور یہ بات بھی بالکل واضح نہ ہوئی تھی کہ ملزم نے انھیں کچھ شرائط پر چھوڑ دیا ہو مگر پھر بھی عدالت کا یہ خیال ہے کہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ملزم نے اس موقع پر بالکل صریحاً اور اپنی سرکاری حیثیت میں کچھ ایسے اصولوں کی اشاعت کی جن سے لوگ قتل کے لئے آمادہ ہوئے۔ اس نے قرآن سے اقتباسات پیش کیے۔ اور یہ کہا کہ جو لوگ سرکار انگلشیہ کی ملازمت میں رہ چکے ہوں وہ ملحد ہیں۔ اور یہ کہ اسلامی قانون کے اعتبار سے ان کی سزا موت ہے۔ اور اس نے یہاں تک کہا کہ اگر باغی سردار نے یہ سزا سرکار کے نوکروں کو نہ دی تو وہ خود خدا کی نگاہ میں گنہگار ہوگا۔

عدالت نے شبہ کی بنا پر ملزم کو اس الزام سے بری کیا کہ ملزم نے سزائے موت کے بدلے سرکار انگلشیہ کی نوکری چھوڑنے کو کہا ہو لیکن یہ بات بالکل صاف اور واضح ہے کہ ملزم نے جن اصولوں کی اشاعت کی تھی ان سے ایسے خونی مناظر دیکھنے میں آئے جو بغاوت کے جزء خاص تھے اور تمام گواہوں کے بیانات سے عدالت یہ سمجھتی ہے کہ ملزم ایک مشیر اور بغاوت کو اکسانے والا شخص تھا۔ اس نے اپنا یہ رویہ دہلی میں بھی رکھا۔ اور یقیناً وہ اودھ مین اس جرم کا مرتکب تھا۔ اس نے ایک بار اس بات کی بھی کوشش کی کہ وہ یہ بات ثابت کر سکے کہ دو فضل حق ہیں۔ جو کہ اودھ کی بغاوت میں منسلک رہے تھے۔ مگر یہ بات بالکل صاف ہے کہ ایک تحصیلدار بریلی تھا جو کہ بعد کو

باغیوں کے ساتھ ایک جتھے کا لیڈر تھا۔ جب کہ ملزم بالکل مختلف شخص ہے۔

یہ شخص کبھی جتھے کے ساتھ نہیں رہا۔ اور کبھی اس نے تلوار ہاتھ میں نہیں لی۔ یہ شخص باغی سردار کے دربار میں تھا اور باغیوں کی عدالت عالیہ کا سب سے زیادہ بااثر ممبر تھا۔ یہ بات مشتبہ ہے کہ آیا یہ عدالت واقعی کوئی حیثیت رکھتی تھی۔ اور آیا ملزم اس عدالت میں کوئی مستقل مقام رکھتا تھا۔ لیکن یہ بات بالکل ثابت ہو چکی ہے کہ کچھ لوگ بیگم اور باغی سردار کو مشورہ دیتے رہتے تھے۔ اور باغیوں کے کیمپ میں انھیں ''اربعہ شوریٰ'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس مجلس کو کبھی کبھی انگریزی نام کچہری پارلیمنٹ بھی کہا گیا ہے۔ اسی مجلس کا ملزم ایک سرگرم اور سربراہ لیڈر تھا۔

براہ راست شہادت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ملزم کو ممو خاں کا اعتماد حاصل تھا اور یہ کہ ملزم سے براہ راست ممو خاں مشورہ لیا کرتا تھا۔ اور اس موقع پر ملزم نے ایسے اصولوں کی اشاعت کی جن سے قتل کے امکانات ہو سکتے تھے۔

قیدی، ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک بہت عقل مند شخص ہے۔ جس نے طاقت اور مشہور ہونے کی ہوس میں یا بے انتہا شدید باتوں سے اثر انداز ہو کر باغیوں کی مجلس میں اپنی اس قدر اثر انداز جگہ بنالی تھی۔ وہ ایک بہت خطرناک ہستی ہے۔

وہ کسی بھی لامحدود نقصانات پہنچا سکنے کا اہل ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جس کا ہندوستان سے ہٹا دیا جانا انصاف اور امن کے لئے ضروری ہے۔ وہ اودھ کا رہنے والا ہے۔ مگر ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جو سب کچھ کے لئے سرکار انگلشیہ کے مرہونِ منت رہے ہیں۔ اور وہ بذات خود سرکار انگلشیہ میں ایک اچھی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر اس نے بہت دنوں سے سرکار انگلشیہ کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ اور بالذّت جگہوں پر اودھ، رام پور اور الور کی ریاستوں پر مامور رہا ہے۔

وہ ہمیشہ ایک مشہور انسان رہا ہے اور جن گواہان نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ انھوں نے بھی مولوی فضل حق کے متعلق پہلے سے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ خود سے دہلی آیا۔ اور اس نے تب ہی سے بغاوت میں حصہ لینا شروع کیا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جسے بہت سخت سزا دینا چاہیے۔ اور جسے بہت احتیاط سے ہندوستان سے الگ کر دینا چاہیے لیکن اس کی ضعیف العمری، اس کی زندگی میں پوزیشن اور اس کے اودھ کے باشندے اور کئی برس تک مختلف دیسی ریاستوں میں کام کرنے کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے یہ مناسب سمجھا ہے کہ وہ ایک سرکاری قیدی تصور کیا جائے نہ

کہ ایک معمولی مجرم۔

وارنٹ نمبر ۱۴۲.........ڈپٹی کمشنر لکھنؤ

فضل حق ولد فضل امام کو مجرم گردانا گیا۔ بوجہ اکسانے بغاوت کے۔ اور بوجہ اشاعت ایسے اصولوں کے جن سے قتل کے حالات پیدا ہو سکتے تھے۔ اور بوجہ باغیوں کی کونسل میں حصہ لینے کے اسے عمر قید بعبور دریائے شور بغیر مشقت کی سزا دی گئی۔ لہٰذا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مندرجۂ بالا سزا کو فضل حق ولد فضل امام پر عمل میں لایا جائے۔ اور یہ کہ تم اس وارنٹ کو جب کہ اس پر عمل درآمد ہو چکے تو اسے اپنی سرکاری مہر اور دستخطوں کے تحت یہ بتلاتے ہوئے کہ مندرجۂ بالا سزا کس طرح عمل میں لائی گئی واپس کردو۔

۱۵۳......۱۸۶۱ء

از طرف کرنل جے کلارک کمشنر و سپر نٹنڈ ینٹ خیر آباد ڈویژن

بنام جی کیمپل اسکوائر جوڈیشل کمشنر اودھ

سیتاپور، ۳۰/ جولائی ۱۸۶۱ء

جناب عالی!

مجھے آپ کے حضور میں مندرجہ ذیل کاغذات پیش کرتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے۔ بہ زبان ہندوستانی کمشنر لکھنؤ کی پروسیڈنگ مورخہ ۲۲/ جولائی ۱۸۶۱ء مع منسلکہ کاغذات کیوں کہ فضل حق کے مقدمے کا تبادلہ لکھنؤ کردیا گیا تھا (جنوری ۱۸۵۹ء میں) اس کا مقدمہ کیپٹن وی تھربرن کے اجلاس میں پیش ہوا تھا۔ جو میرا خیال ہے آپ کا Special ascistant تھا۔

آپ کا فرماں بردار خادم

کمشنر و سپر نٹنڈنٹ خیر آباد ڈویژن

۴۸۰: بنام سکریٹری چیف کمشنر اودھ لکھنؤ۔ مورخہ ۳/ اگست ۱۸۶۱ء

جناب عالی!

کنارے سے نوٹ کی ہوئی خط و کتابت کے حوالے سے جو کہ فضل حق کے مقدمے سے متعلق ہیں فضل حق کو میں نے بغاوت کے اکسانے وغیرہ کے جرم میں مئی ۱۸۵۹ء میں عمر قید بعبور دریائے شور (قید بغیر مشقت) کی سزا دی تھی۔ میں آپ کے حضور میں خیر آباد کے کمشنر سے وصول

شدہ ورنا کولر کاغذات بسلسلۂ مقدمہ ہذا پیش کر رہا ہوں۔ اور استدعا کرتا ہوں کہ ان کاغذات کو چیف کمشنر کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ تاکہ ان پر احکام دے سکیں جو وہ ضروری اور مناسب سمجھتے ہوں۔

میں ہوں آپ کا مخلص

جوڈیشل کمشنر

روداد:

ڈاکٹ نمبر ۳۲۲ مورخہ ۱۷/ مارچ ۱۸۵۹ء سکریٹری کا دفتری کاغذ نمبری ۶۵۶۔ مورخہ ۲۸/ اپریل جو میرے پتے پر بھیجا گیا میرے منٹ نمبری ۶۵۷ مورخہ ۱۰/ مئی ۵۹ء۔

نمبر ۱۹۷۵............ ازطرف سکریٹری چیف کمشنر اودھ

بنام جی کیمپل اسکوائر جوڈیشل کمشنر اودھ۔

لکھنؤ۔ ۱۲/ اگست ۱۸۶۱ء

جناب عالی!

بحوالہ آپ کے خط نمبری ۴۸۰ مورخہ ۳/ اگست مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں عرض کروں کہ Officiating چیف کمشنر نے آپ کے اوپر حوالہ دیئے ہوئے مرسلہ کو دیکھا اور وہ سخت مخالفت کریں گے اگر منشی فضل حق کے سلسلے میں کچھ بھی رعایت کی گئی۔ (۲) جو ورنا کولر کاغذات آپ کے مراسلے کے ساتھ منسلک تھے وہ واپس کیے جا رہے ہیں۔

میں ہوں آپ کا فرماں بردار خادم

سکریٹری چیف کمشنر اودھ

گورنمنٹ کے حکم مورخہ ۲۰/ اپریل ۱۸۵۹ء سے اقتباس:

فضل حق کے سلسلے میں **His Excellency in Council** کی یہ خواہش ہے کہ قیدی کی شخصیت اور عمر کو مد نظر رکھتے ہوئے کوئی سختی اس پر اس طرح نہ کی جائے جو اس کی عمر کے منافی ہو۔

اصل اقتباس جوڈیشل کمشنر اودھ

مندرجہ ذیل قیدی واسطے عمر طبعی مسمّٰی فضل حق ۳۶۸ Penal

Settlement پورٹ بلیئر پر ۱۸؍اکتوبر کو بذریعہ اسٹیمر Frire

Queen براہ کلکتہ وصول کیا گیا۔

دستخط سپرنٹنڈنٹ پورٹ بلیئر

پوری مسل پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ علامہ خیرآبادی کو دہلی اور اودھ کی سرگرمیوں کی بنا پر پھانسا گیا تھا۔ اور فضل حق شاہجہاں پوری کے الزامات، ہمنامی کی وجہ سے لگا کر مجرم گردانا گیا تھا۔ سوء اتفاق سے عبدالحکیم سرکاری ملازم اور مرتضیٰ حسین خیر خواہ برطانیہ سے جو دونوں شیعی تھے علامہ سے کسی وقت قرآنی آیات پر مباحثہ ہو گیا تھا۔ ان کی جھوٹی شہادتوں پر عدالت نے سزا کا فیصلہ کر دیا۔ برطانوی حکومت کی یہ پالیسی آخر عہد تک رہی۔ اور آج بھی ان کے سرکاری شاگرد قانونی گرفت میں لانے کے لئے یہی داؤ پیچ کھیلتے رہتے ہیں جس کی ہزاروں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

اس مباحثہ کے متعلق علامہ الثورۃ الہندیہ میں لکھتے ہیں:

> ''میری چغلی ایسے دو مرتد جھگڑالو اور تند خو افراد نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے۔ جس کا حکم یہ تھا کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی مودّت و محبت پر مصر تھے۔ انھوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔'' (دو مرتد جھگڑالو اور تند خو افراد سے مراد عبدالحکیم شیعی اور مرتضیٰ حسین شیعی ہیں۔ مترجم)

اس مقدمہ میں علامہ کو مموخاں کا مشیر اور بوندی کے قیام میں اس پر اثر انداز ہونا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جب کہ مموخاں کے متعلق علامہ الثورۃ الہندیہ میں یہ اظہار رائے کر رہے ہیں۔

''یہ تمام امور مہمہ اور ان کا اہتمام و انصرام ایسے ذلیل، غافل اور متحیر عامل کو سونپا گیا تھا جو کسی طرح اس کا اہل نہ تھا۔ وہ صحیح مشوروں سے گریزاں اور جہل سے ہمکنار تھا۔ آسان بات

کو سخت اور دشوار کو آسان سمجھتا۔ وہ ذلیل احمق اور بزدل تھا۔ اس نے مکالمت اور مشاورت، مجالست اور منادمت کے لئے احمق، جاہل اور ذلیل طبقہ کو چن رکھا تھا۔ وہ نخوت وغرور کی بنا پر شریف سرداروں اور عقلمند رہنماؤں سے بچتا اور اپنے ہی اہل خاندان اور اعزہ میں سے جاہلوں اور احمقوں کو مصاحب وحاکم بناتا۔ چنانچہ اس ناتجربہ کار نے لشکروں پر کمین، بزدل، ذلیل اور رذیل، لوگوں کو سردار بنا دیا۔ وہ بڑے ہی لالچی تھے۔'' (غافل اور متحیر عامل سے مراد مموخاں ہے۔ مترجم)

غور فرمایئے جس مموخاں کے متعلق علامہ کی یہ رائے ہو اس کے مشیر کیسے بن سکتے تھے؟ علامہ نے اس مقدمہ میں جو بیان دیا ہے اس کا تجزیہ کرنے سے ہمارے اس دعویٰ کی پوری تائید ہوتی ہے کہ علامہ کا دوران بغاوت دہلی میں موجود ہونا اور بغاوت میں بڑی حد تک سرگرمی سے رہنمائی کرنا کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔

حکومت کا دستور العمل مرتب کرنا، فتوائے جہاد مرتب کرنا اور تقاریر کرنا، ان سب باتوں کا ثبوت اپنے مقام پر ملاحظہ کیا جائے۔

علامہ عدالت کے سامنے اپنے بیان میں فرماتے ہیں:

''میں الور کے راجہ کی ملازمت میں تھا۔ میں ان کے ساتھ ۵ سال رہا۔ اور بغاوت کے شروع ہونے پر بھی ان کے ساتھ تھا۔ راجہ (بنی سنگھ) کی موت کے ایک ماہ بعد تک میں الور میں رہا۔ اگست ۱۸۵۷ء میں میں نے الور چھوڑ دیا۔ میں نے دہلی کے لئے کوچ کیا۔ وہاں ۱۵ر دن رہا۔ اور پھر الور لوٹ آیا۔ میں نے اپنا خاندان الور ہی میں رہنے دیا تھا۔ میں اپنے گھر رہا تھا۔ اور میں نے کسی کی ملازمت نہیں کی۔ نہ ہی میں باغیوں سے ملا تھا۔''

یہ ملحوظ رہے کہ یہ عدالتی بیان ہے۔ اس میں بڑی احتیاط کے ساتھ الفاظ کا استعمال ہوا ہے جس سے علامہ کی بے پناہ ذہانت کا پتہ چلتا ہے کہ بات سچی بھی ہو اور مقدمہ پر اثر انداز بھی نہ ہو۔ مثلاً یہ جملہ کہ ''میں ان (راجہ) کے ساتھ ۵ سال رہا۔'' یعنی ان کی ملازمت میں ۵ سال رہا۔ اس کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ شبانہ روز ان کے ساتھ رہا اور ان سے کسی وقت علیحدہ نہیں ہوا۔''

دوسرا جملہ ''بغاوت کے شروع ہونے پر بھی ان کے ساتھ تھا۔'' کتنی سچی بات ہے۔

بغاوت وسط مئی ۱۸۵۷ء میں شروع ہوئی۔ جوں ہی اس کی اطلاع ملی علامہ اہل خانہ کو الور چھوڑ کر دہلی آ گئے۔ اور سرگرمی سے بغاوت کی رہنمائی اور حکومت کے دستور العمل کی ترتیب شروع کر دی۔ جولائی میں جنرل بخت خاں کے دہلی آنے پر فتوائے جہاد مرتب کر کے علماء کے دستخط کرائے۔ اسی درمیان راجہ الور بنی سنگھ (موت ۵/ جولائی ۱۸۵۷ء) کی خبر ارتحال پر الور چلے گئے۔ تقریباً ایک ماہ میں واپس دہلی آ گئے۔ پھر ۱۵/ یوم دہلی میں قیام کر کے الور آ گئے۔ اور اپنے اہل و عیال کو لے کر اوائل ستمبر میں دہلی آ گئے۔ وسط ستمبر ۱۸۵۷ء میں دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ (بتاریخ ۱۹/ ستمبر ۱۸۵۷ء)۔

بادشاہ اور اس کے متعلقین مقبرۂ ہمایوں میں اقامت گزیں ہو گئے۔ علامہ بھی دہلی کو خیر باد کہہ کر خیر آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ فرماتے ہیں:

> "جب نصاریٰ کا شہر پر اچھی طرح قبضہ ہو گیا اور کوئی لشکری و شہری باقی نہ رہا۔ غلّہ اور پانی دشمنوں کے ظلم و استبداد کی وجہ سے ناپید ہو گیا۔ تو پانچ شبانہ روز اسی حالت میں گذار کر اپنی عزیز ترین متاع کتابیں، مال و اسباب چھوڑ کر (بار برداری کا انتظام نہ ہو سکنے کی وجہ سے) خدا پر بھروسہ کر کے اہل و عیال کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا۔" (الثورۃ الہندیہ)

علامہ اس سفر میں ریاست بھیکم پور ضلع علی گڑھ پہنچ کر نواب عبدالشکور خاں شروانی (عم محترم نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمٰن شروانی) کے کچھ دن مہمان بھی رہے۔ اس طرح وطن مالوف خیر آباد خاصے عرصے کے بعد پہنچے۔

بیان میں فرمایا "میں نے کسی کی ملازمت نہیں کی" یقیناً اس مدت میں کہیں ملازم نہیں رہے۔ پھر فرمایا "نہ ہی میں باغیوں سے ملا تھا"۔ کتنی سچی بات ہے۔ علامہ تو مجاہدین سے ملے تھے۔ مغلیہ حکومت کے تو انگریز باغی تھے۔ علامہ تو مجاہدین کے سربراہ تھے۔ انگریزوں اور ان کے حواریوں سے ملنے کا سوال ہی کیا تھا۔

جنوری ۱۸۵۹ء میں علامہ کو خیر آباد سے گرفتار کر لیا گیا۔ اور فروری ۱۸۵۹ء میں ابتدائی عدالت سے سزا دے دی گئی۔ اور مارچ ۱۸۵۹ء میں عدالت عالیہ سے اس کی توثیق کر دی گئی۔

یہ بات پوری طرح ذہن نشیں رکھیے کہ مقدمہ میں براہ راست عدالتی بیان علامہ کا ذاتی

ہے۔اس کے علاوہ جتنی بھی درخواستیں یا اپیلیں ہیں وہ سب علامہ کے خلاف وکلاء مقدمہ کی کار گزاریاں ہیں جس کی تائید مرزا غالب کے خط بنام یوسف مرزا سے بھی ہوتی ہے:

''مولانا (فضل حق) کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا۔ کچھ مجھ سے تم معلوم کرو۔ مرافعہ حکم دوام جبس بحال رہا، بلکہ تاکید کی گئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا۔ان کا لڑکا ولایت میں اپیل چاہتا ہے۔کیا ہوتا ہے جو ہونا تھا۔وہ ہو چکا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔'' (اردوئے معلیٰ)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان اپیلوں اور درخواستوں سے علامہ کا ذاتی طور پر تعلق نہ تھا اس لئے یہ کہنا کہ ''علامہ رہائی کے لئے آخر دم تک کوشش کرتے رہے اور ہمت نہیں ہارے۔'' سراسر الزام اور ناانصافی ہے۔علامہ نے جو کچھ مانگا اپنے رب سے مانگا جس کی شہادت الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند سے ملتی ہے۔

اب آیئے لائق صد احترام مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور جناب مالک رام کے ان مضمونوں پر نظر ڈالیں۔ جو ماہنامہ تحریک دہلی میں اگست ۱۸۵۷ء اور جون ۱۹۶۰ء میں علی الترتیب شائع ہوئے ہیں۔جن سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ علامہ کا جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہ تھا۔یہ دونوں بزرگ راقم الحروف کے دیرینہ کرم فرما اور مشفق و مخلص رہے ہیں۔ان پر قلم اٹھانا یا حرف گیری کرنا شائستگی کے خلاف تھا۔مگر یہ دونوں بزرگ جب اپنے سے بزرگ تر شخصیت پر خامہ فرسائی کر چکے ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ ''ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز شود۔''

محترم عرشی صاحب نے اپنے ۷ صفحات پر مشتمل مضمون میں علامہ کی جہاد آزادی میں عدمِ شرکت کی تین بنیادیں قائم کر کے طبع آزمائی فرمائی ہے۔

(۱) علامہ کا اگست سے قبل دہلی میں نہ ہونا۔ (۲) فتویٰ جہادِ آزادی مشمولہ سونتنر دہلی (۳) نواب رام پور کے نام علامہ کی درخواست۔

(۱) اب پہلی بات یعنی اگست سے قبل علامہ کے دہلی میں نہ ہونے کی بنیاد ''باغی ہندوستان'' کی اس عبارت کو بنایا گیا ہے کہ:

''علامہ الور سے نشر و اشاعت کرتے ہوئے اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے۔''

نیز منشی جیون لال کے ۱۶ / اگست کی اس خبر کو کہ:

''مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے۔ انھوں نے اشرفی نذر میں پیش کی اور صورتِ حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔''

باغی ہندوستان کی ترتیب ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ اوائل ۱۹۴۷ء میں مطبع مدینہ پریس بجنور سے شائع ہوئی۔ اس وقت تک جو مواد میسر آسکا تھا اسی پر انحصار کرنا پڑا تھا۔ آزادی کے بعد جو مواد دستیاب ہوا اس کی بنا پر ثابت ہوتا ہے کہ علامہ ''غدر'' شروع ہوتے ہی دہلی پہنچ گئے تھے۔ محترم عرشی صاحب جیسے محقق کو تو ''باغی ہندوستان'' کے نظریہ کی تغلیط کرنی تھی۔ نہ کہ اسی کو بنیاد بنا کر عمارت کی تعمیر شروع کر دی۔

محترم عرشی صاحب نے باغی ہندوستان کی اشاعت کے پورے دس سال کے بعد مضمون تحریر فرمایا تھا۔ پورا موقع ملا تھا کہ اپنی محققانہ جودتِ طبع کو کام میں لاتے۔

ابر تھا، بجلی تھی، سورج زیرِ کوہِ قاف تھا
زلفِ شبگوں رخ سے سرکائی تو مطلع صاف تھا

داغ

اب ہمارے دعویٰ کو اس کسوٹی پر جانچیے۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب (فضل حق) عالم تبحر مشہور تھے۔ وہ الور سے ملازمت ترک کر کے دہلی آئے تھے۔ انھوں نے بادشاہ کے لئے ایک دستور العمل سلطنت لکھا تھا جس کی ایک دفعہ یہ مشہور ہوئی تھی کہ گائے کہیں بادشاہی عمل داری میں ذبح نہ ہو۔'' (تاریخ عروج انگلشیہ جلد ۵۔ ص ۶۸۷)

جیون لال کا بیان ہے کہ یہ دفعہ ۹ / جولائی ۱۸۵۷ء کو نافذ کر دی گئی۔ (غدر کی صبح و شام۔ ص ۱۶۳)

ایک انگریز رابرٹ لکھتا ہے:

اس خاص موقعہ (عید الاضحیٰ) پر ہندوؤں کا لحاظ کرتے ہوئے قربانی ملتوی کر دی گئی اور اس کی جگہ فرنگیوں کو ختم کرنے کے لئے ہندو مسلمانوں کی زبردست متحدہ کوشش ہو رہی ہے۔'' (جنگ آزادی۔

ص ۱۹۱۔ خورشید مصطفیٰ رضوی)

مولوی ذکاء اللہ کی تحریر اور دوسرے حوالوں سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ علامہ نے حکومت کا دستور العمل مرتب کیا تھا۔ اس دستور العمل کی ایک دفعہ کورٹ کے قیام کی بھی تھی جس کے قواعد بھی علامہ نے بنائے تھے۔ جس کا عکس ''سونتنر دہلی'' میں موجود ہے۔ اور ''فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون'' (از محمود احمد برکاتی ٹونکی) میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

دستور العمل تیار کرنا اصحاب رائے اور بادشاہ کی منظوری حاصل کرنا اور پھر اس کا نفاذ اس کے لئے دو تین ماہ کا عرصہ کچھ زیادہ مدت نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ جولائی سے بہت پہلے دہلی میں موجود تھے۔ نہ صرف بقر عید بلکہ عید بھی دہلی میں ہی کی ہوگی۔ جو اواخر مئی ۱۸۵۷ء میں ہوئی تھی۔

(۲) اب محترم عرشی صاحب کی دوسری بنیاد فتویٰ جہاد آزادی کو لیجیے۔ آپ نے کتاب ''سونتنر دہلی'' کے عکس فتویٰ مطبوعہ صادق الاخبار دہلی مؤرخہ ۲۶/ جولائی ۱۸۵۷ء منقولہ از اخبار الظفر دہلی کو نقل کر کے تحریر فرمایا ہے۔ کہ اس پر مولانا فضل حق کے دستخط نہیں جب کہ دیگر ۳۳ علما کے دستخط ہیں۔ فرماتے ہیں:

> ''چوں کہ یہ فتویٰ مولانا کے ورودِ دہلی سے پہلے مرتب ہو کر شائع ہو چکا تھا اس لئے اس پر مولانا خیر آبادی کے دستخط نہیں ہو سکتے تھے۔''

اس فتویٰ پر تاریخ نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکتا کہ اشاعتِ اخبار سے کتنے عرصے پہلے کا لکھا ہوا ہے ہو سکتا ہے کہ مئی (۱۸۵۷ء) کے وسط میں ترتیب دیا گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی فتویٰ کے متعلق علامہ نے ''الثورۃ الہندیہ'' میں لکھا ہو۔

> ''یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ بعض شہر و دیہہ سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت علما و زہاد و ائمۂ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر جدال و قتال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔''

محترم عرشی صاحب نے اسی ایک فتویٰ پر انحصار کر کے حکم لگا دیا کہ چوں کہ اس فتویٰ پر علامہ کے دستخط نہیں ہیں اس لئے علامہ خیر آبادی کا فتویٰ جہاد سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است؟

یہ فتویٰ، جہاد کے فرض عین اور فرض کفایہ کے استفتا کے جواب میں ہے۔ غالباً علامہ نے اسی کے متعلق جملہ ''جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر'' سے اشارہ کیا ہے۔

یہ فتویٰ صادق الاخبار دہلی میں ۲۶ رجولائی ۱۸۵۷ء کو شائع ہوا۔ اخبار الظفر دہلی سے نقل ہوا ہے۔ اخبار الظفر دہلی میں کب چھپا اور کب ترتیب دیا گیا اس کا کچھ پتہ نہیں۔ ہمیں محترم عرشی صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ ''یہ فتویٰ مولانا کے ورودِ دہلی سے پہلے مرتب ہو کر شائع ہو چکا تھا۔'' مگر ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں کہ یہی وہ فتویٰ ہے جو جنرل بخت خاں نے مرتب کرایا تھا۔ اور یہ کہ علامہ کا ورودِ دہلی اگست سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ جب شروع جولائی میں جنرل بخت خاں دہلی پہنچے تو علامہ وہیں موجود تھے۔

یہ فتویٰ جنرل بخت خاں کے ورود دہلی سے قبل لکھا جا چکا تھا۔ بقول مولوی ذکاء اللہ:

''جب تک دہلی میں بخت خاں نہیں آیا جہاد کے فتویٰ کا چرچا بہت کم تھا۔''

وہ یہی فتویٰ تھا جو صادق الاخبار میں شائع ہوا ہے۔ اب آپ مولوی ذکاء اللہ کی پوری عبارت پڑھیے.

> ''جب تک دہلی میں بخت خاں نہیں آیا۔ جہاد کے فتویٰ کا چرچا بہت کم تھا۔'' مساجد میں منبروں پر جہاد کا وعظ کمتر ہوتا تھا...... مگر جب بخت خاں جس کا نام اہل شہر نے کم بخت خاں رکھا تھا۔ دہلی میں آیا تو اس نے یہ فتویٰ لکھایا کہ مسلمانوں پر جہاد اس لئے فرض ہے کہ اگر کافروں کی فتح ہو گی تو وہ ان کے بیوی بچوں کو قتل کر ڈالیں گے۔
>
> اس نے جامع مسجد (دہلی) میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتویٰ پر دستخط ومہریں ان کی کرالیں لیکن مولوی محبوب علی وخواجہ ضیاء الدین نے فتوے پر مہریں نہیں کیں۔ (تاریخ عروج عہد انگلشیہ۔ ج ۵۔ ص ۶۷۵۔ مؤلفہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی)
>
> جنرل بخت خاں بڑی سلیقہ مندی اور ہوشیاری سے شروع جولائی میں دہلی آیا۔ (ایضاً۔ ص ۶۸۱)

مولوی ذکاء اللہ کے مذکورہ بالا بیان سے صاف ظاہر ہے کہ دو فتوے تھے ایک وہ جس کا چرچا

شہر میں بہت کم تھا اور جس پر مولوی محبوب علی اور خواجہ ضیاء الدین کے بھی دستخط ہیں۔ اور یہ فتویٰ وہی ہے جو جنرل بخت خاں کے دہلی پہنچنے سے پہلے دیا گیا تھا۔ اور جس کا عکس سوتنتر دہلی میں شائع ہوا ہے۔ اسی کا ذکر الثورۃ الہندیہ میں علامہ نے کیا ہے۔

اب باغی ہندوستان کی عبارت پر نظر ڈالیے:

> ''علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورے کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد (دہلی) میں علماء کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی اور سید مبارک شاہ رامپوری نے دستخط کر دیئے۔ اس فتوے کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔
> (ص ۱۵۶۔ باغی ہندوستان۔ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور۔ ۱۹۴۷ء)

غور فرمایئے۔ باغی ہندوستان میں جتنے نام دیئے گئے ہیں ان میں سے مفتی صدر الدین کی مہر اور مولوی عبدالقادر کے سوا کسی عالم کے دستخط صادق الاخبار کے فتویٰ پر نہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ دو فتوے ہیں۔ اخبار الظفر دہلی کا فتویٰ وہ ہے جو جنرل بخت خاں کے ورودِ دہلی سے قبل لکھا گیا تھا۔ اور بقول مولوی ذکاء اللہ اس کا چرچا شہر میں بہت کم تھا۔ اس کے مجیب نور جمال تھے۔ دوسرا فتویٰ وہ ہے جو جنرل بخت خاں کی موجودگی میں لکھا گیا اور جسے علامہ خیر آبادی نے مرتب کیا۔ تیسرے فتوے کا ذکر سرسید احمد خاں نے ''اسباب بغاوتِ ہند'' میں کیا ہے جسے انھوں نے خود دیکھا تھا جو عدم وجوب جہاد کا آئینہ دار تھا۔

(۳) تیسری بنیاد عرضی بنام نواب رامپور کو لیجیے:

یہ عرضی علامہ خیر آبادی کی مہر سے مزین ہے۔ اور ۱۸ر فروری ۱۸۵۹ء کی مرقومہ ہے۔ اس عرضی کی بنا پر محترم عرشی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''مولانا پر حسب ذیل تین الزام عائد کیے گئے تھے:
>
> (الف) نواب خان بہادر خاں نبیرۂ حافظ رحمت خاں بہادر نے جب انگریزوں کے خلاف بریلی میں بغاوت کی تو مولانا نے ان کا ساتھ دیا اور

ان کی طرف سے نظامت پیلی بھیت کا کام انجام دیا۔

(ب) جب انگریزوں نے بریلی فتح کرلی تو مولانا یہاں سے بھاگ کر اودھ پہنچے اور خان علی خاں کی طرف سے ریاست محمدی کے چکلہ دار مقرر ہوئے۔

(ج) مولانا نے اس کے بعد ایک باغی لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔''

مقدمہ کی پوری کارروائی درج کی جاچکی ہے۔ان میں سے کوئی الزام علامہ پر عائد نہیں کیا گیا۔علامہ ۳۰/جنوری ۱۸۵۹ء کو گرفتار کرلیے گئے۔بغاوت کے قیدی مجرم تھے۔الثورۃ الہندیہ میں فرماتے ہیں:

''میرا جوتا اور لباس اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیئے۔نرم و بہتر بستر چھین کر خراب، سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالے کر دیا۔گویا اس پر کانٹے بچھادیئے گئے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئی۔میرے پاس لوٹا، پیالا اور کوئی برتن تک نہ چھوڑا۔''

انصاف کیجیے۔ایسی حالت میں مہر رکھنے کی اجازت دے دی گئی ہوگی یا کاغذ اور قلم دوات مہیا کر دیا ہوگا کہ علامہ عرضی لکھ کر مہر لگا کر نواب رام پور کو بھیج دیں؟ اور وہ بھی جب کہ اس کے دودن کے بعد ہی ۲۱/فروری کو مقدمہ شروع ہو رہا ہو۔پھر لکھنؤ سے رام پور تک عرضی پہنچنے میں اس زمانہ میں کتنی مدت لگی ہوگی؟

یہ عرضی رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔میری دیکھی ہوئی ہے۔نہ علامہ کا رسم الخط ہے نہ طرز بیان اور نہ ہی اس پر دستخط ہیں۔آخر دستخط کرنے میں کیا چیز مانع تھی؟اصل چیز دستخط ہوتے ہیں مہر تو تائید میں ہوتی ہے۔

پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ۱۸/دن میں علامہ نے تابڑ توڑ ۳/عرضیاں روانہ کیں۔جن میں سے دو بقول عرشی صاحب ضائع ہوگئیں۔یہ تیسری اور آخری عرضی ہاتھ لگی۔ریاستی محافظ خانہ کی داد دیجیے کہ اس نے ایک عرضی جناب عرشی صاحب کی تعمیرِ عمارت کے لئے سنگِ بنیاد بنا کر محفوظ رکھی۔اس عرضی پر بنیاد قائم کرلینا عرشی صاحب جیسے محقق سے باعثِ تعجب ہے۔پھر ستم بالائے ستم یہ کیا گیا کہ دونوں بزرگوں (محترم عرشی صاحب اور محترم مالک رام صاحب) نے علامہ خیر آبادی کی جہاد وآزادی میں شرکت سے ہی انکار کر دیا۔

انھیں کو آج میرا ذکر سن کر طیش آتا ہے
ہمیشہ جن کی خاطر کیں چمن آرائیاں میں نے

اب قدیم وجدید مؤرخین کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ فیصلہ اربابِ نظر خود فرمالیں گے.

غم زندگی کی حکایتیں بھی شریک جرم وخطا نہ ہوں
میں سناؤں قصۂ درد دل اگر آپ سن کے خفا نہ ہوں

''مولوی فضل حق جب سے الور سے آئے ہیں وہ فوجیوں اور شہریوں کو برطانیہ کے خلاف بھڑکانے میں مسلسل مصروف ہیں......

''مولوی فضل حق کی اشتعال انگیزیوں سے متأثر ہوکر شہزادے بھی میدان میں نکل آئے ہیں۔ اور سبزی منڈی کے پھل والے محاذ پر صف آرا ہیں۔''
(اخبار دہلی۔ رپورٹ تراب علی)

''مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔'' (اخبار دہلی۔ ص ۲۷۳۔ فائل ۱۲۷۔ رپورٹ از چنی لال)

''مولوی صاحب (فضل حق) جب بھی بادشاہ سے ملتے وہ بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جنگ کے سلسلے میں رعایا کی ہمت افزائی کریں۔ اور ان کے ساتھ باہر نکلیں۔ اور دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں۔''
(میموریز حکیم احسن اللہ خاں۔ ص ۲۴)

''بادشاہ نے جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضل حق پر مشتمل ''کنگ کونسل'' بنائی۔'' (دی گریٹ ریولیشن آف ۱۸۵۷ء۔ ص ۱۲۸ وص ۱۸۳)

مجلس شوریٰ دس ارکان پر مشتمل بنائی گئی تھی۔ جس میں ۶ رفوجی اور ۴ شہری تھے۔ مخبر تراب علی نے خفیہ رپورٹ دی۔

''مولوی فضل حق بھی اس کے ایک رکن ہیں:'' (میوٹنی ریکارڈ۔ جلد ۱۱۔ حصہ ۱۱/ ۸/ ۹)

''اس کورٹ کا ڈائرکٹر (نگراں) مولانا خیرآبادی کو بنایا گیا۔'' (بہادر شاہ دوم۔ ص ۱۸۲)

بادشاہ کی طرف سے حاصل اختیارات کے تحت علامہ نے:
حسن بخش عرض بیگی کو ضلع علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مقرر کیا۔
(غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط۔ص ۱۲۹)
مولانا فیض احمد بدایونی کو ضلع بلند شہر کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مقرر کیا۔ (ایضاً)
مولانا عبدالحق (خلف علامہ) کا تقرر کلکٹر گوڑ گانوہ کی حیثیت سے کیا گیا۔
(روز نامچہ جیون لال۔ص ۲۲۲)
میر نواب (عزیز قریب علامہ) کو دہلی کا گورنر مقرر کیا گیا۔ (ایضاً۔ص ۱۰۲)
''جب ہنگامہ برپا ہوا تو مولوی فضل حق آئے۔ دربار میں حاضر ہوئے۔ نذر پیش کی۔ روپیہ صدقے اتارا۔ انھیں انتظام سنبھالنے کی خواہش تھی۔
(روز نامچہ عبداللطیف مرتبہ خلیق احمد نظامی)
حکیم احسن اللہ خاں اپنی یادداشتوں (مرتبہ سید معین الحق (کراچی)۔ص ۲۳) میں لکھتے ہیں
''دوسرے روز مولوی فضل حق آئے اور نذر پیش کی۔ وہ باغی فوج کی بڑے زور شور سے تعریف کر رہے تھے۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا اب وقت کا تقاضا ہے کہ باغیوں کو رقم اور سامان رسد کی مدد پہنچائی جائے تا کہ انھیں کچھ سہارا ہو۔ بادشاہ نے کہا رقم کہاں ہے؟ رہا رسد کا تو وہ پہنچی تھی مگر نا کافی تھی۔ اور اس کی وجہ ان باغیوں کا عوام کے ساتھ غلط رویہ ہے۔
مولوی صاحب نے کہا۔ حضور کے تمام ملازمین نا اہل ہیں۔ دور اور قریب کے تمام حکمرانوں سے رقم کا مطالبہ کرنے کی اجازت دیجیے۔ میرا لڑکا (مولانا عبدالحق) اور دیگر اعزہ تحصیل کا کام انجام دیں گے۔ اور رسد بھی فراہم کریں گے۔
بادشاہ نے جواب دیا آپ تو یہیں ہیں۔ آپ انتظام سنبھالیے۔
مولوی صاحب نے جواب دیا۔ میرے لڑکے اور دوسروں کو گوڑ گانوہ کی تحصیلداری اور کلکٹری کا پروانۂ تقرر جاری کیا جائے۔ وہ سب انتظام

کرلیں گے اور اور الور، جھجر، بلب گڑھ اور پٹیالہ کے راجاؤں کے نام بھی (رقم کے مطالبے کے) پروانے جاری کیجیے۔ پٹیالہ کا راجہ اگرچہ انگریزوں سے ملا ہوا ہے لیکن اگر دوستانہ مراسلت کی جائے تو وہ ساتھ آجائے گا۔

بادشاہ نے بتایا کہ پیرزادہ عبدالسلام کی درخواست پر بخت خاں نے راجہ پٹیالہ کو ایک پروانہ بھیج دیا ہے مگر ابھی تک اس کا جواب نہیں آیا۔ مولوی صاحب نے کہا میں اپنے بھائی (فضل عظیم) کو جو راجہ کے یہاں ملازم ہیں لکھوں گا کہ وہ جلد جواب بھجوائیں۔

مولوی صاحب جب بھی بادشاہ کے پاس آتے بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جہاد کی مہم میں اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں۔ اور ان کے ساتھ باہر بھی نکلیں۔ فوجی دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں ورنہ اگر انگریز جیت گئے تو نہ صرف خاندان تیموریہ بلکہ تمام مسلمان نیست و نابود ہو جائیں گے۔''

بہادر شاہ کے مقدمہ میں حکیم احسن اللہ خاں نے شہادت دیتے ہوئے کہا:

''زمین دارانِ گوڑ گانوہ نے بادشاہ کو ایک درخواست ارسال کی تھی جس میں بدنظمی کا ذکر کر کے التجا کی تھی کہ کوئی افسر نظم و نسق کے لئے مقرر کیا جائے۔ مولوی فیض الحق (فضل حق) جو الور سے آئے تھے اپنے بھانجے کا (جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا) کی سفارش کی کہ وہ وہاں مقرر کر دیا جائے۔ کیوں کہ گورنمنٹ برطانیہ کے دَورِ حکومت میں وہ اس ضلع میں مقرر تھا۔ چنانچہ یہ شخص ضلع دار مقرر کیا گیا۔ مگر میں آگاہ نہیں ہوں کہ وہ گوڑ گانوہ گیا یا نہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ زوال دہلی کے ۱۵/۲۰/روز قبل یہ تقرر ہوا تھا۔ مولوی فضل حق نے بھی کئی تحصیلداروں کو ضلع دار کی نیابت میں مقرر کیا تھا۔'' (بہادر شاہ کا مقدمہ۔ ص ۲۵۶)

۱۹/اگست ۱۸۵۷ء......

''عبدالحق خلف مولوی فضل حق اور مولوی فیض احمد لگان وصول کرنے کی غرض سے گوڑ گانوہ گئے۔'' (بیان جیون لال جاسوس۔ غدر کی صبح و شام دہلی۔ ص ۲۲۲)

اودھ کے چیف کمشنر کا سکریٹری، کلکٹر ہمیر پور کو ۸؍دسمبر ۱۸۵۸ء کو سرکاری مراسلے میں لکھتا ہے:

''باغی بسوا میں جو لکھنؤ سے شمال مغرب میں پچاس میل کے فاصلے پر ہے شکست کھا کر ۵؍دسمبر کو گنگا فرار ہو گئے..........

ان کی تعداد ۹۰۰ سوار جن میں ۴۰۰ پوری طرح مسلح ہیں اور باقی سپاہیوں کے پاس اسلحہ کافی نہیں ہے۔ ۳۰۰؍پیدل وغیرہ تھے ان میں ۱۰۰ عورتیں، ۶ ہاتھی ایک توپ جس کا نام گروہ ہے۔ اس جماعت کے لیڈر فیروز شاہ شہزادہ دہلی، لکڑ شاہ، گلاب شاہ عرف پیر جی، محسن علی خاں ساکن منٹو شمس آباد، فرخ آباد (جو خود کو یورپین ظاہر کرتا ہے) اور مولوی فضل حق سابق سررشتہ دار کمشنر دہلی جس کے بہت سے اعزہ اعلیٰ مناصب حکومت پر ہیں۔ اور جس کا بھائی پٹیالہ میں راجہ ہری سنگھ کا ملازم ہے۔'' (فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش۔ دوم۔ ص ۵۶۳)

یہی سکریٹری ۱۱؍دسمبر ۱۸۵۸ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری کو لکھتا ہے:

مندرجہ ذیل لوگوں کے چلے جانے کے بعد حکومت کو قیامِ امن میں کافی سہولت ہو رہی ہے۔ فیروز شاہ، لکڑ شاہ، مولوی فضل حق جو ہماری حکومت کا دشمنِ جان ہے، حالانکہ حکومت نے اسے اور اس کے اعزہ کو اعلیٰ مناصب عطا کیے تھے۔'' (فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش۔ دوم۔ ص ۵۶۵)

''کچھ لوگ مولوی فضل حق کی صحیح خبر لانے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ جو اپنے متبعین کے ساتھ شاہ آباد کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔'' (ایضاً۔ ص ۵۱۸)

مشہور انگریز مصنف ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر اپنی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے اس وقت کے صدر مدرس مولانا عبدالحق خیرآبادی (فرزند علامہ) کے متعلق لکھتا ہے۔

''موجودہ ہیڈ مولوی اس عالم دین کے صاحبزادے ہیں جن کو ۱۸۵۷ء کے غدر نے نمایاں کر دیا تھا۔ اور جنھوں نے اپنے جرموں کا خمیازہ اس طرح بھگتا تھا کہ بحر ہند کے ایک جزیرے میں تمام عمر کے لئے جلاوطن کر دیئے جائیں۔ اس غدار عالمِ دین کا کتب خانہ جس کو حکومت نے ضبط

کرلیا تھا، اب کلکتہ کالج میں موجود ہے۔'' (ترجمہ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ص ۲۹۴)

''ان (فضل حق) کو اس بغاوت کے سبب سے جلاوطنی کی سزا ملی تھی۔''
(تاریخ عروج عہد انگلشیہ۔ص ۶۸۷ مؤلفہ ذکاء اللہ)

علامہ فضل حق خیرآبادی کے جہادِ آزادی میں بھرپور حصہ لینے کی معاصرین کی شہادتیں آپ نے ملاحظہ کرلیں اب جدید حوالے بھی دیکھیے:

''۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف مسلح بغاوت ہوئی تو مولوی فضل حق نے اس بغاوت میں نمایاں حصہ لیا۔ بغاوت کے الزام میں ان پر مقدمہ چلایا اور عمر قید سزا پائی۔'' (اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (لاہور)۔ج ۱۵۔ص ۳۷۵)

علامہ فضل حق نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزوں کے خلاف سخت حصہ لیا۔ جس کے نتیجے میں گرفتار کر کے کالے پانی بھیج دیئے گئے جہاں اس فاضلِ اجل، عالم بے بدل نے نہایت کس مپرسی، بے بسی اور لاچاری کی حالت میں ۲۰/ اگست ۱۸۶۱ء کو انتقال کیا۔ اور علم و دانش اور فضل و ہنر کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔'' (حاشیۂ مقالات سرسید۔حصہ ۱۶۔ص ۳۳۰)

''جنرل بخت خاں کی تحریک پر مولانا فضل حق خیرآبادی اور دوسرے علماء نے جو جہاد کا فتویٰ دیا اس کے بارے میں مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے بھی اپنی تاریخ میں اقرار کیا ہے کہ اس سے مذہبی جوش و خروش بہت بڑھ گیا تھا۔'' (جنگ آزادی۔ص ۴۵۵۔از خورشید مصطفیٰ رضوی)

''مولانا (فضل حق خیرآبادی) کے دہلی پہنچنے سے پیش تر بھی لوگوں نے جہاد کا پرچم بلند کر رکھا تھا۔ مولانا پہنچے تو مسلمانوں کو جنگ آزادی پر آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہوا جس پر علمائے دہلی کے دستخط لیے گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور انھوں نے علماء کے نام تجویز کیے۔ جن کے دستخط لیے گئے۔'' (۱۸۵۷ء کے مجاہد از غلام رسول مہر ص ۲۰۶)

''جب برطانوی استعمار کے خلاف ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو بعض شاعروں، ادیبوں اور عالموں نے اس میں سرگرمی سے حصہ لیا اور انگریزی حکومت کا اقتدار بحال ہو جانے کے بعد ان پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مولانا فضل حق کو جہاد کا فتویٰ صادر کرنے کے جرم میں انڈمان بھیجا گیا، صہبائی کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا۔ شیفتہ کو قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں۔'' (مجلہ خیال لاہور۔ ۱۸۵۷ء نمبر۔ ص ۳۱۸)

''مولانا فضل حق خیر آبادی علمی قابلیت میں نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان کو فتویٰ جہاد اور جرمِ بغاوت میں انڈمان بھیج دیا گیا۔'' (بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد۔ از رئیس احمد جعفری۔ ص ۳۱۵)

محمد اسمٰعیل پانی پتی مضمون ''۱۸۵۷ء میں علمائے کرام کا حصہ'' میں لکھتے ہیں:

''جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ عظیم دہلی میں رونما ہوا تو (مولانا فضل حق) فوراً دہلی پہنچے اور جہاد کا فتویٰ دیا۔ جنرل بخت خاں کمانڈر ان چیف، افواج ظفر سے ملے اور اس کی بڑی اعانت اور امداد کی۔'' (مجلہ لیل و نہار لاہور۔ جنگ آزادی نمبر۔ ص ۲۸)

''مولانا فضل حق نے ایک دن بعد نماز جمعہ جامع مسجد (دہلی) میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ پڑھ کر سنایا تو بہتوں کے لئے باعث تشویش بنا۔ اس فتویٰ پر مفتی صدرالدین آزردہ اور دوسرے پانچ علماء کے دستخط تھے۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ جد و جہد نے ایک نیاز ور پکڑا اور جگہ جگہ انگریزوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ تاریخ ذکاءاللہ کے مطابق اس فتویٰ کے بعد صرف دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی۔'' (ص ۹۲۔ سہ ماہی الزبیر بھاول پور۔ تحریک آزادی نمبر۔ ۱۹۷۰ء)

پاکستان میں دیوبندی مکتب فکر کے آرگن خدام الدین لاہور میں مولانا محمد مستقیم احسن حامدی فاضل دیوبند لکھتے ہیں:

''مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ تاریخ کے ان جواں مرد اور نڈر

مجاہدین میں سے تھے جن کی جرأت و ہمت اور حق گوئی و بے باکی نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

''مولانا فضل حق خیرآبادی نے "افضل الجہاد کلمة حق عند سلطان جائر" کا فریضہ ادا کیا۔ اور اپنی عمر عزیز انڈمان میں حبس دوام کی نذر کردی......

علامہ فضل حق خیرآبادی وغیرہ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دے کر مسلمانوں کو عدم تعاون پر آمادہ کیا......

مولانا فضل حق خیرآبادی بھی باغی قرار دیئے گئے۔ سلطنت مغلیہ کی وفاداری، فتویٔ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں مولانا ماخوذ کر کے سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔'' (ہفت روزہ خدام الدین لاہور۔ ص ۹ و ۱۰۔ شمارہ ۲۳ر نومبر ۱۹۶۲ء)

''دلاور جنگ مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی آگرہ سے لکھنؤ آئے۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے خلاف علماء میں سرگرمی عمل پیدا کررہے تھے۔ مولانا (فضل حق) بھی ان کے ہمنوا ہوگئے۔ اور سرکاری ملازمت ترک کر کے الور چلے گئے۔ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء رونما ہوا۔ دلی آئے۔ بہادر شاہ سے ملے۔ یہاں جنرل بخت خاں کے ٹھاٹ جمے ہوئے تھے۔ نصاریٰ کے خلاف جہاد کا فتویٰ مولانا نے دیا۔ اور اس پر مفتی صدرالدین آزردہ مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی وغیرہ کے دستخط کرائے گئے۔'' (علمائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں، مؤلفہ مفتی انتظام اللہ شہابی۔ ص ۵۶)

''دہلی میں بہادر شاہ نے خود مختاری کا اعلان کردیا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی نیز دوسرے علماء دہلی میں موجود تھے......

''جنرل بخت خاں کے مشورے سے علامہ فضل حق خیرآبادی نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں جہاد کی اہمیت و ضرورت پر تقریر کی۔ جہاد کا استفتاء

مرتب کر کے پیش کیا۔ جہاد کے فتویٰ کی تیاری میں جنرل بخت خاں کی کوشش خاص تھی۔" (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد! مولانا فیض احمد بدایونی۔ مؤلفہ محمد ایوب قادری۔ ص ۲۱و۲۲)

"مسلمانوں کو عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کے لئے آخری مرتبہ جان کی بازی لگا دینے پر آمادہ کرنے کے لئے ایک باقاعدہ فتویٰ جہاد کا جاری کیا گیا۔ جس پر دستخط کرنے والوں میں مفتی صدرالدین آزردہ اور مولوی فضل حق بھی شریک تھے۔ مولانا فضل حق نے فتویٰ کے بعد جگہ جگہ دورے کیے اور بالآخر دہلی پہنچ گئے......

مولانا فضل حق کے مشورے صرف قلعہ معلی کی پوشیدہ مجلسوں تک محدود نہ تھے وہ جنرل بخت خاں سے ملے۔ مشورے ہوئے۔ اور آخر میں بعد نماز جمعہ دلّی کی جامع مسجد میں علماء کے سامنے تقریر کی اور فتویٰ پیش کیا۔" (مجلّہ خیال لاہور۔ ۱۸۵۷ء نمبر، ص ۲۶۳و۲۶۴۔ مضمون ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

"مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کو جو کہ تحریک کے بہت بڑے رکن تھے اور بریلی، علی گڑھ اور اس کے ملحقہ اضلاع کے دوران تحریک میں گورنر تھے۔ آخران کو گھر سے گرفتار کیا گیا......

خدا کے بندے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں وہ جان کی پروا کیے بغیر سر بکف ہو کر میدان میں نکلتے ہیں۔" (تحریک ریشمی رومال از مولانا حسین احمد مدنی۔ ص ۶۴و۶۵)

تحریک آزادی کی مشہور تاریخ نگار سیدہ انیس فاطمہ بریلوی رقم طراز ہیں:

"خواص میں جنرل بخت خاں، فیروز شاہ، نانا راؤ، نواب تجمل حسین خاں، جنرل محمود خاں، اور عظیم اللہ خاں تھے۔ اور علماء کے سرگروہ مولوی احمد اللہ، مولوی لیاقت علی اور مولوی فضل حق خیر آبادی قرار پائے۔" (۱۸۵۷ء کے ہیرو۔ ص ۷۰)

"جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی

میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ جب انگریزوں کو فتح ہوئی تو گرفتار کر لیے گئے۔'' (علم وعمل۔ ترجمۂ وقائع عبدالقادر خانی۔ جلد اول۔ ص ۲۵۶)

''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی......

انڈمان ونکوبار کے زمانۂ قیام میں علامہ خیرآبادی سے دو چیزیں یادگار ہیں۔ الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند۔ یہ دونوں چیزیں تاریخی ہونے کے علاوہ ادب کا بھی شاہکار ہیں......

یہ رسالہ اور قصیدے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات کے نہایت قابل قدر ماخذ ہیں۔'' (سہ ماہی اردو کراچی۔ مقالہ محمد ایوب قادری۔ ص ۶۲۔ شمارہ جنوری ۱۹۶۸ء)

پروفیسر خلیق احمد نظامی مرتب روزنامچہ عبداللطیف ص ۹۶، ۹۷و۱۶۲، ۱۶۳ پر لکھتے ہیں:

''جب زمانے میں شور وشر پھیلا تو مولوی فضل حق خیرآبادی نے دہلی کا عزم کیا اور بارگاہ میں باریابی کے آرزومند ہوئے اور نذر اور نثار کے لئے بہت سا روپیہ پیش کیا۔''

''مولوی فضل حق نے مختلف علوم میں خاص مرتبہ حاصل کیا تھا۔ فن منطق میں ان کا علمی سرمایہ اجتہاد کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا۔''

مشہور ادیب ومؤرخ رئیس احمد جعفری اپنی کتاب ''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد'' ص ۸۸۲ میں لکھتے ہیں:

''وہ (فضل حق خیرآبادی) انگریزوں سے نفرت کرتے تھے۔ اور انگریزوں کو نکالنے کے لئے منظم اور باقاعدہ تحریک میں حصہ لینے پر دل و جان سے آمادہ رہتے تھے۔ چنانچہ غدر جب شروع ہوا تو مولانا بے تأمل

شریک ہوئے۔ وہ بہادر شاہ کے معتمد، مقرب اور مشیر تھے۔ ان کے دربار میں شریک ہوا کرتے تھے۔ انھیں اہم معاملات ومسائل پر مشورے دیتے تھے۔ اور اس بات کے ساعی تھے کہ آزادی کی یہ تحریک کامیاب ہو اور انگریز اس دیش سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائیں۔ مولانا نے غدر میں دلیری اور جرأت کے ساتھ علانیہ حصہ لیا۔ انھوں نے متعدد والیانِ ریاست اور امرائے ہند کو اس تحریک میں شامل کرنے کی کوشش کی جس جس والیِ ریاست سے ان کے ذاتی تعلقات ومراسم تھے۔''

......۱۸۵۹ء میں مولانا فضل حق خیر آبادی کو مغلیہ حکومت کی وفاداری اور انگریزوں کے خلاف بغاوت میں شریک ہونے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ (آزادی کے مجاہد۔ ص ۳۵۔ از محمود الرحمٰن)

''۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مولانا فضل حق الور سے دہلی پہنچے اور دہلی سے بعد از خرابیِ بسیار اودھ پہنچے۔ بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر ہوئے۔ بعد ازاں مولانا فضل حق گرفتار ہوئے۔ بغاوت کے جرم میں اس یگانۂ روزگار شخصیت پر مقدمہ چلا۔'' (روزنامہ حریت کراچی۔ مضمون محمد ایوب قادری۔ شمارہ ۳۹ جولائی ۱۹۷۷ء)

''۱۸۵۹ء میں جب غدر کے بعد انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو اور لوگوں کے ساتھ مولانا فضل حق پر بھی جرم بغاوت عائد کیا گیا۔ اور حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم ہوا۔'' (ص ۳۲۹۔ داستان تاریخ اردو۔ از حامد حسن قادری)

''ہماری پہلی جنگ آزادی کے ہیرو بلاشبہ انگریزی فوجی اور سول افسران سے کسی طرح قابلیت اور حب الوطنی میں کم نہیں تھے۔ جنرل بخت خاں، جنرل محمود خاں، بیگم حضرت محل، مولانا احمد اللہ شاہ، سید لیاقت علی، مولانا فضل حق، خان بہادر خاں، نانا راؤ، تانتیا ٹوپی، شہزادہ فیروز شاہ، جھانسی کی رانی، محمد علی خاں عرف جیمی گرین وغیرہ مجاہدین کے لیڈر تھے۔ اور اپنی اپنی جگہ بڑی خوبیوں کے لوگ تھے۔ (جنگ آزادی نمبر۔ ص ۱۰۵۔ ماہنامہ

ترجمان اہل سنت کراچی۔ مضمون سید مصطفیٰ علی بریلوی علیگ)

سوویت یونین کی سائنس اکیڈمی کے ادارۂ علوم شرقیہ کی ایک ممتاز رکن مادام پولونسکایا لکھتی ہیں:

''مولانا فضل حق الور تشریف لائے جہاں انھوں نے انگریزوں کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پرچار کیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ زمین دار جو برطانوی حکومت سے مطمئن نہیں ہیں اس کی بنیادی طاقت ہوں گے۔ مولانا موصوف کے معاصرین اور ان کے سوانح نگاروں نے ان کے بہت سے خطوط کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کو لکھے تھے۔ انھوں نے برطانیہ کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پیغام دیا تھا۔ بغاوت کے زمانے میں مولانا انگریزوں کے مخالفوں کی صف میں رہے۔''

''مولانا فضل حق خیرآبادی کے سماجی اور سیاسی نظریات سامراجی محکومی کے جوئے سے ملک کو آزاد کرنے کی اس خواہش کے آئینہ دار تھے جو پوری قوم کے سینے میں پروان چڑھ رہی تھی۔ اس حیثیت سے ان کی جملہ سرگرمیاں ہندوستان کے قومی مفاد کو پورا کرتی تھیں۔'' (پندرہ روزہ سودیت دیس، دہلی۔ شمارہ جولائی ۱۹۵۸ء)

محترم عرشی صاحب کے مضمون بعنوان ''مولانا فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٔ جہاد'' مطبوعہ ماہنامہ تحریک دہلی بابت ماہ اگست ۱۹۵۷ء نے اہل علم میں کیسی غلط فہمیاں پیدا کیں اس کا اندازہ جناب مالک رام کے مضمون ''مولانا فضل حق خیرآبادی'' مطبوعہ ماہنامہ تحریک دہلی بابت ماہ جون ۱۹۶۰ء سے لگایا جاسکتا ہے جو عرشی صاحب کی تائید میں فتویٔ جہاد کے ساتھ مطلق شرکتِ جہاد سے انکار کر بیٹھے۔

ناطقہ سر بگر بیاں ہے اسے کیا کہیے؟

اسی قسم کی غلط فہمی کی عکاسی مندرجۂ ذیل مکتوب کر رہا ہے۔

۷۸۶

''کامٹی ضلع ناگپور مہاراشٹر

مورخہ ۳ / مارچ ۱۹۸۲ء

معظم و محترم جناب مولانا عبدالشاہد خاں صاحب شروانی مدظلہ العالی۔ سلام و رحمت،

بہت برسوں سے جناب سے غائبانہ تعارف ہے۔اب پہلی بار قلمی تخاطب کا شرف حاصل کرر ہا ہوں......

سہ روزہ دعوت کی ۲۸ رفروری ۸۲ء کی اشاعت میں مولانا فضل حق خیر آبادی کے فتویٔ جہاد پر آپ کا توضیحی مضمون (بجواب مضمون حکیم نجمی سکندر پوری مطبوعہ سہ روزہ دعوت دہلی مورخہ ۱۳ر ۱۹۸۲/۲ء) نظر نواز ہوا۔ ماہنامہ تحریک کا وہ پرچہ میرے پاس بھی محفوظ ہے۔جس میں مولانا عرشی کا مضمون شائع ہوا ہے۔اس مضمون نے علمی حلقوں میں بڑی غلط فہمی پیدا کی ہے۔اوراس کے اثرات بھی بہت ہوئے ہیں۔ میں بھی اس مضمون سے ذہنی طور پر کشمکش میں مبتلا رہا ہوں۔اب جناب کے توضیحی مضمون سے اطمینان کی صورت پیدا ہوئی۔ اتنے اہم اور تاریخی معاملہ میں اتنی طویل عرصے تک خاموشی مناسب نہیں تھی۔ بہر حال پھر بھی اب آپ کے ذریعے قلمی طور پر جو کچھ ہوا وہ غنیمت ہے۔جس کے لئے علمی دنیا آپ کی شکر گذار ہوگی۔''

زیادہ والسلام،
محتاج دعا محمد ظہیر وارثی
مقام کامٹی ضلع ناگپور، مہاراشٹر

....

اپنے مٹنے کی ہمیں کچھ نہیں پروا لیکن
تو نے سوچا ہے کچھ اپنا بھی زیاں اے ساقی؟

مقدمہ کی کارروائی، معاصرین و مؤرخین کی شہادتیں اور انگریزوں کے بیانات کی روشنی میں محترم بزرگ جناب امتیاز علی خاں عرشی رام پوری اور جناب مالک رام صاحب کے نظریۂ عدم شرکتِ جنگِ آزادی پر نظر ڈالیں تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ:

حریفِ صافی و دردی نہ ای خطا ایں جاست
تمیزِ ناخوش و خوش می کنی بلا ایں جاست

اوراس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

تفاوت ست میان شنیدنِ من و تو
تو بستن در و من فتحِ باب می شنوم

ہمارے یہ دونوں بزرگ ہمیشہ غازیِ گفتار رہے غازیِ کردار کبھی نہ بن سکے۔ ساحل پر کھڑے ہوکر شناورانِ بحرِ بیکرانِ سیاست و جہادِ حریت کا تماشا دیکھتے رہے۔ ان کے عنفوان شباب سے ہندوستان کے دریائے جنگ آزادی میں دسیوں تلاطم و مدوجزر آئے مگر یہ اپنی عافیت پسندی اور راحت آشامی کے حصار سے باہر نہ نکل سکے۔ جب کہ ہزاروں جواں مرد اور باہمت خواتین مصائب انگیزی اور جاں سپاری کا مظاہرہ کرتے رہے۔

بنا کر دند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت مارا

....

اس موضوع پر ''فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون'' مرتبہ مولانا حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی ثم کراچوی مطبوعہ برکات اکیڈمی کراچی ۱۹۷۵ء اور ''امتیاز حق'' مرتبہ راجہ غلام محمد۔ (شائع کردہ مکتبہ قادریہ لاہور ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء و المجمع الاسلامی مبارکپور ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء) خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ہماری بھی ماخذ رہی ہیں۔

....

مقدمے سے متعلق پوری روئداد آپ نے پڑھ لی۔ اب الثورۃ الہندیہ کے متعلق مضحکہ خیز شبہات پر بھی نظر ڈال لیں۔

محترم نادم سیتاپوری اپنی کتاب ''غالب نام آورم'' میں اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند کے کوئلوں اور پنسل سے لکھے ہوئے منتشر پرزے جب مولانا عبدالحق خیرآبادی کو مفتی عنایت احمد کاکوروی کے ذریعہ ملے تو وہ اپنے والد ماجد علامہ فضل حق کی رہائی کے لئے کوشاں تھے۔ انھیں خطرہ ہوگا کہ پرزے مرتب ہوکر حکام وقت کے ہاتھ لگ گئے تو رہائی مشکل ہوگی۔ اس لئے اس میں ترمیم کردی گئی ہوگی۔ (ص ۱۲۴۔ غالب نام آورم۔ از نادم سیتاپوری مطبوعہ لاہور)

اس کا جواب محترم محمد ایوب قادری (کراچی) نے دیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) داخلی یا خارجی شواہد پیش کیے بغیر محض ظن و تخمین سے رسالہ و قصائد کو مشکوک قرار دینا درست نہیں ہے۔

(۲) یہ رسالہ وقصائد مولانا عبدالحق کی زندگی میں شائع نہیں ہوئے لہذا حکومت کے خوف کی بنا پر تحریف وترمیم کی ضرورت کیا تھی؟

(۳) اس رسالہ وقصائد میں حکومت برطانیہ پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ اگر حکومت کے خوف سے ترمیم کی گئی ہوتی تو لب ولہجہ نرم ہوتا۔

(۴) ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء میں مفتی عنایت احمد کاکوروی رہا ہوکر آئے۔ ایک دو ماہ کے بعد رسالہ اور قصائد مولانا کو پہنچے ہوں گے۔ ۱۲/ صفر ۱۲۷۸ء کو علامہ فضل حق کا وصال ہوجاتا ہے اس لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ مولانا عبدالحق نے علامہ کے وصال کے بعد رسالہ وقصائد کی طرف توجہ دی ہوگی۔ لہذا علامہ کی رہائی کے لئے کوشش ان کی ترتیب سے مانع نہ ہوئی ہوگی۔ (ص ۶۳ و ۶۴۔ جزائر انڈمان ونکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات، از محمد ایوب قادری، سہ ماہی اردو کراچی، شمارہ جنوری ۱۹۶۸ء)

میرے خیال سے قادری صاحب کو جواباً ان دلائل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ نادم صاحب زبان عربی اور اس کے ادب سے نابلد محض ہیں۔ علامہ کے اسلوب بیان اور طرز نگارش کو وہ خود تو کیا سمجھ سکتے ہیں بڑے سے بڑا ماہر لسان ولغت بھی کتب لغات کی مدد کے بغیر علامہ کے مفہوم تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر کوئی ترمیم کی گئی ہوتی وہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند ہوتی۔

اب خود محمد ایوب قادری صاحب کا شبہ ملاحظہ فرمائیں۔ اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''جزائرِ انڈمان ونکوبار میں دفتر قائم ہوچکا تھا۔ اسکول کھل چکا تھا۔ عدالتی کارروائیاں جاری تھیں۔ وہاں کے انگریز حکام کی اجازت سے تصنیف و تالیف کا کام جاری تھا تو پھر کوئلے سے لکھنے کا کیا قرینہ؟
>
> مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی انڈمان سے رہا ہوکر آئے تو اپنے ساتھ اپنی تین کتابیں بھی لائے جن میں سے ''تواریخ حبیب اللہ'' اور ''علم الصیغہ'' شائع ہوکر مقبول عام ہوئیں۔ جب یہ تین کتابیں بحفاظت پہنچ گئیں تو رسالہ اور قصائد کے پہنچنے سے کیا مانع تھا؟

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟

موصوف نے سوچا کہ نادم سیتاپوری دور کی کوڑی لائے تو میں کیوں محروم رہوں؟ لیاقت

آشکارا کرنے کے لئے کوئی نئی بات پیدا کرنی ہی چاہیے۔

رسالہ وقصائد کو ''علم الصیغہ'' اور ''تواریخ حبیب الٰہ'' اور ''غدر'' کے حالات کو موجودہ حالات پر قیاس کرنا انھیں جیسے مفکر کا کام ہو سکتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد میں تحریر فرماتے ہیں:

''حال اس زمانے کا دوسرا تھا۔ ''غدر'' کے حوادث کا تذکرہ اور پھر ایسے شخص کی زبانی جسے بجرم بغاوت مدۃ العمر قید کی سزا دی گئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ خطرناک بات یقین کی جاتی تھی۔'' (تعارف باغی ہندوستان)

تواترِ روایت کی تغلیط کی جسارت بڑی ہمت چاہتی ہے جس کی قادری صاحب کے پاس کمی نہیں۔

خود لکھتے ہیں کہ ''تواریخ حبیب الٰہ'' اور ''علم الصیغہ'' شائع ہو کر مقبول عام ہوئیں۔ یہی بات تھی تو رسالہ وقصائد ۱۹۴۶ء تک کیوں شائع ہو کر مقبول عام نہ ہوئے؟ اور کیوں ان کی معدودے چند نقلیں خواص نے حرزِ جاں بنا کر رکھیں؟

پرزوں پر لکھ کر بھیجنے میں مصلحت یہی تھی کہ اگر راہ میں کسی کے ہاتھ لگ جائیں تو اسے کچھ ہاتھ نہ آئے۔ اس کی ترتیب میں خلف الرشید مولانا عبدالحق خیر آبادی جیسے فاضل کو کیا دقتیں پیش آئی ہوں گی۔ یہ وہی جانتے ہوں گے۔ مولانا تو "الولد سرّ لابیہ" تھے کہ فائز المرام ہو گئے۔

ہرچہ در طبعِ تو نہ آید راست
تو ندانستہ ای، مگو کہ خطاست

(ص ۲۴۸ تا ۲۸۱۔ باغی ہندوستان طبع چہارم المجمع الاسلامی مبارک پور ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء)

☆☆☆☆☆☆☆

چند اغلاط کی تصحیح

حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی)

دوسرے اعاظمِ رجال کی طرح مولانا فضل حق خیر آبادی بھی ابتدا ہی سے مختلف و متعدد ''اغلاط'' کا ہدف رہے ہیں۔ اور ان اغلاط کو ایک خاص گروہ بڑے اہتمام سے بار بار دہراتا رہا۔ ہم مولانا فضل حق کے پرستار نہیں ہیں۔ ان کو خطا و نسیان سے مبرّا نہیں سمجھتے۔ ہوسکتا ہے کسی بڑے سے بڑے پاکباز میں کوئی اخلاقی کمزوری پائی جاتی ہو مگر ایک مؤرخ کی حیثیت سے ہمارا فرض یہ ہے کہ اس کے محاسنِ اخلاق کے ساتھ معائب کا ذکر بھی ناگزیر سمجھتے ہیں تو سند اور حوالے کے ساتھ کریں۔ بے بنیاد الزامات، گپ اور افواہ کی قلعی بالآخر کھل کر رہتی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص تو اپنی مظلومیت کی بنا پر ہمدردیوں کا مستحق بن جاتا ہے اور مؤرخ کی تحریر پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہے اور اس کا بھرم باقی نہیں رہتا۔

مولانا فضل حق کے متعلق غلط بیانیاں زیادہ تر ایک خاص گروہ کے حضرات نے کی ہیں۔ جس نے بھی شاہ اسمٰعیل دہلوی کے سوانح کو موضوع بنایا اس نے شاہ صاحب کی مدح کے ساتھ مولانا فضل حق کی قدح کو بھی لازمی قرار دیا ہے۔ مولانا کا جرم صرف یہ تھا کہ جب شاہ اسمٰعیل نے ۱۸۱۸ء میں امامِ معین کی تقلید ترک کر کے "تمسك بالكتاب والسنة" کا (بزعم خود) پرچم بلند کیا اور ''تقویۃ الایمان'' کے نام سے اردو میں ایک رسالہ لکھا۔ جس کا نہ صرف اندازِ بیان حسنِ ادب سے عاری تھا بلکہ جمہور امت کے عقائد کے برعکس شفاعت کا انکار بھی کیا تھا۔ اور نظیرِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے امتناع کا بھی انکار تھا۔ تو دہلی کے دینی حلقوں میں ہلچل مچ گئی۔ اور وقت۔ کر

علما جن میں اکثریت ولی اللٰہی علما کی تھی سخت برہم ہوئے۔ مگر چونکہ شاہ اسمٰعیل حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے تھے۔ اس لئے کسی کو حرفِ اختلاف زبان پر لانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

اس نازک لمحے میں مولانا فضل حق نے جرأت سے کام لے کر امتناع النظیر کے مسئلے پر شاہ اسمٰعیل کے جواب میں ایک رسالہ تالیف فرمایا۔ اور پھر "تحقیق الفتویٰ فی اِبطال الطغویٰ" کے نام سے ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائی۔ جس پر علمائے عصر اور خانوادۂ ولی اللٰہی سے وابستہ علما کے بھی دستخط تھے۔

مولانا کے اس اقدام نے دوسرے علما کی بھی ہمت افزائی کی اور وہ میدان میں آ گئے۔ ابتداءً نجی گفتگوؤں تک بات محدود رہی مگر شاہ عبدالعزیز کے وصال (١٢٣٩ھ/١٨٢٣ء) کے فوراً بعد دہلی کی جامع شاہجہانی میں ایک تاریخی مجلس مناظرہ (١٢٤٠ھ) منعقد ہوئی۔ جس میں ایک طرف شاہ اسمٰعیل کے اعوان وانصار تھے۔ دوسری طرف باقی علمائے حق پرست۔ شاہ اسمٰعیل تو دورانِ مناظرہ برہم ہو کر چل دیئے۔ مولوی عبدالحیٔ بڈھانوی نے بھی اٹھنا چاہا مگر نہ اٹھ سکے۔ اور آخر میں انھیں کئی باتوں کو تسلیم کرنا اور لکھ کر دینا پڑا۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کا یہ وہ جرم ہے جو آج تک معاف نہیں کیا گیا۔ اور ان کی تخفیفِ شان وتفسیق وتضلیل کا کوئی موقع اب بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ اور صرف مولانا فضل حق ہی تک بات محدود نہیں رہی۔ مولانا کے تمام وابستگانِ داماں اور اصحاب سلسلہ اس انتقام کا شکار ہیں۔ مولانا کے فرزند علامہ عبدالحق خیرآبادی، ان کے تلامذہ خصوصاً مولانا سید برکات احمد ٹونکی پر اتہامات ایسے ایسے "ثقہ اور متدیّن اور داعی الی اللہ" بزرگوں نے لگائے ہیں کہ انسان متحیر ہو جاتا ہے۔ میں ان اتہامات کا جائزہ "حیات عبدالحیٔ پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک مضمون میں لے چکا ہوں۔ (العلم کراچی۔ اپریل۔ جون ١٩٧٢ء) اس وقت صرف ان کرم فرمائیوں کا جائزہ لینا مقصود ہے جو مولانا فضل حق خیرآبادی کی ذات گرامی پر روا رکھی گئیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا نام نواب صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالی کا ہے۔ پہلے آپ مولانا صدیق حسن خاں کا ایک جملہ سن لیں۔ مولوی محمد محسن ترہتی نے اپنی کتاب "الیانع الجنی" میں شاہ اسمٰعیل کی تقویۃ الایمان پر یہ تبصرہ کیا تھا کہ اس کے بعض حصوں میں عسل وتمر کی

سی حلاوت ہے اور بعض میں حنظل کی سی تلخی۔ اس پر نواب صاحب فرماتے ہیں کہ مولوی محسن کے اس تبصرے کا راز یہ ہے کہ وہ مولانا فضل حق کے شاگرد ہیں۔ اور

فانه اولُ من قام بصدّہٖ و تصدّیٰ لردہٖ فی رسائله التی لیست علیها اُثارة من الکتاب و السنة۔ (ابجد العلوم مؤلفه نواب صدیق حسن بھوپالی بحواله نزهة الخواطر الجزء السابع۔ ص ۵۹)

(مولانا فضل حق) وہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے (شاہ اسمٰعیل سے) اختلاف کیا۔ اور اپنے ان رسائل میں (شاہ اسمٰعیل کا) رد کیا۔ جس میں علمِ کتاب وسنت کا کوئی اثر ونشان نہیں ہے۔

نواب بھوپالی صاحب کے اس جملے سے آپ کو ہماری اس بات کی تصدیق ہوگئی ہوگی کہ مولانا سے کد صرف اس لئے ہے کہ انھوں نے شاہ اسمٰعیل کے رد میں پہل کی تھی۔ پھر آپ نے انداز فکر بھی دیکھ لیا کہ ایک انصاف پسند نے تقویۃ الایمان پر ایک درمیانی سی بات لکھ دی تھی کہ اس میں حلاوت بھی ہے اور تلخی بھی۔ تو یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ اور اس کو مولانا فضل حق کے تلمذ کے اثرات پر محمول کیا۔ نواب صاحب نے مولانا کے متعلق فرمایا ہے:

کان زیُّه زیَّ الأمراءِ دونَ العلماءِ (ابجد العلوم۔ بحواله نزهة الخواطر)

ان کی سج دھج علما کی سی نہیں تھی۔ امراء کی سی تھی۔

ہم نے نواب صاحب کے اس جملے کو اس لئے اہمیت دی ہے کہ یہ حضرات اس بات کو بار بار دہراتے ہیں۔ مرزا حیرت نے بھی یہی لکھا ہے۔ اور مولوی سید عبدالحئ رائے بریلوی نے بھی اس کی تکرار کی ہے۔ لطف یہ ہے کہ بات کسی نے بھی واضح نہیں کی کہ زِیِ علما اور زیِ امراء (زی۔ وضع قطع، سج دھج) کا کیا مطلب ہے؟ اور ان دونوں میں بنیادی فرق کیا ہے؟

اگر ان حضرات کا یہ مطلب ہے کہ وہ غیر شرعی لباس پہنتے تھے تو صاف صاف لکھنا چاہیے تھا تاکہ ہم شرعی لباس کا مطلب پوچھتے۔ کیوں کہ شریعت نے تو کچھ اصول اور کچھ حدود مقرر کر دیئے ہیں۔ اور اس کے بعد آزادی دی ہے۔ ہاں قدامت پسند علمائے ہند بے شک اس باب میں متشدد

رہے۔ مگران کے معیار بھی بدلتے رہے۔ پوششِ سر کے سلسلے میں صافے کو شرعی لباس سمجھا جاتا اور علما کے لئے لازمی تصور کیا جاتا تھا۔ مگر مولانا ابوالکلام آزاد نے صافے کا تکلف روا نہیں رکھا۔ وہ اپنی مخصوص (غیر عالمانہ) ٹوپی پہنتے تھے۔ اور بڑے بڑے علما ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔ اور پھر انقلاب آیا تو دیوبند کے مشاہیر علما کو ہم نے گاندھی کیپ برسر بھی دیکھا۔ یہی حال پاجامے کا ہے ایک دَور وہ بھی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایک خاص قسم کی شلوار کو شرعی پاجامہ کہا جاتا تھا اور علی گڑھ پاجامہ علما کے لئے معیوب و ممنوع تھا۔ لیکن بتدریج وہ بھی رائج ہو گیا۔ اسی صدی کے آغاز میں انگر کھے کی جگہ اچکن یا شیروانی پہننے والوں کو فیشن ایبل کہا جاتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ ہم تو زِیّ امرا اور زِیّ علما کے فرق سے واقف نہیں ہیں۔

اگر زِیّ امرا سے ان حضرات کی مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دولت علم کے ساتھ دولت دنیا سے بھی بہرہ مند ہونے کی بنا پر تحدیثِ نعمت کرتا ہے اور شایان شان لباس پہنتا ہے تو یہ فرمایا جائے کہ یہ کس امام کے نزدیک حرام ہے؟ ہم نے امام الائمہ ابوحنیفہ، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ وغیرہ متعدد اکابر وائمہ کے متعلق پڑھا ہے کہ وہ نہ صرف صاف ستھرا بلکہ اعلیٰ درجے کا لباس پہنتے تھے۔ خود نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کے متعلق متعدد ثقہ حضرات سے لباس کے اہتمام اور غیر شرعی اسباب زینت پر توجہ کے متعلق سنا ہے اور ان کی جو تصویر نظر سے گذری ہے اس میں وہ زِیّ علما کے بجائے زِیّ امرا میں نظر آتے ہیں۔

اور شاہ اسمٰعیل کے لباس کے متعلق تو جعفر تھانیسری نے لکھا ہے کہ وہ ہمہ وقت سپاہیانہ وضع رکھتے تھے۔ گلے میں الخالق اور چست پاجامہ، سر پر پیچیدہ عمامہ اور گلے میں تلوار حمائل کیے رہتے تھے۔ (سوانح احمدی۔ طبع کراچی۔ ص ۳۱۰)

دوسری بات نواب بھوپالی صاحب نے یہ فرمائی ہے کہ:

> و کان بینه و بین استاذی العلامه محمد صدر الدین خاں الدهلوی مؤدة اکیدة و محبة شدیدة لانهما کانا شریکین فی الاشتغال علی استاذٍ واحد و علی ابیه الفاضل فضل امام۔ مع ذلك یسخط استاذی علیه فی بعض امور منها رده علی الشیخ الحافظ الواعظ المحدث الاصولی الحاج

الغازی الشهید محمد اسمٰعیل الدهلوی۔ و یقول لا ارضیٰ منک و لیس هذا بعثك۔ (ابجد العلوم۔ بحواله نزهة الخواطر الجزء السابع۔ ص ۲۷٦)

مولانا فضل حق اور میرے استاد علامہ محمد صدرالدین خاں (آزردہ) دہلوی کے درمیان بڑی دوستی اور محبت تھی۔ اس لئے کہ دونوں ایک استاد کے شاگرد تھے اور مولانا فضل حق کے فاضل والد (مولانا) فضل امام کے بھی دونوں شاگرد تھے۔ مگر اس کے باوجود میرے استاد مولانا فضل حق کو ان کے بعض کاموں پر بُرا بھلا کہا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ مولانا فضل حق نے حضرت حافظ واعظ محدث اصولی حاجی غازی شہید محمد اسمٰعیل دہلوی کا رد کیا تھا۔ استاد ان سے فرمایا کرتے تھے کہ میں تمہاری اس بات سے خوش نہیں ہوں اور یہ تمہیں زیب نہیں دیتی۔

ایک دوست کا دوسرے کو ٹوکنا تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ مولانا صدرالدین آزردہ تو مولانا فضل حق کو اس بات پر بُرا بھلا کہیں کہ انھوں نے شاہ اسمٰعیل کا رد کیا تھا۔ جب کہ:

وہ خود شاہ اسمٰعیل کے خیالات سے متفق نہیں تھے۔ اور بقول مولانا فضل رسول بدایونی (۱) انھوں نے شاہ اسمٰعیل صاحب کو سمجھا کر اس سے باز رکھنا چاہا تھا۔ (۲) مولانا آزردہ تعین یوم میلاد کے قائل تھے۔ (۳) مولانا قیام فی المیلاد کو بھی مستحسن جانتے تھے۔ (۴) "منتہی المقال" میں بھی وہ وہابی نقطۂ نظر کے خلاف گئے ہیں۔ اور جوش وخروش کے ساتھ وہابیہ کا رد کیا ہے۔ (۵) امتناع النظیر کے باب میں بھی ان کا ایک قلمی رسالہ میرے کتب خانہ میں ہے۔ وہ اس میں بھی شاہ صاحب سے کلیۃً متفق نہیں تھے۔

ان حقائق کی موجودگی میں میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ نواب بھوپالی صاحب کا اپنے استاد پر افترا ہے کہ وہ مولانا فضل حق سے اس لئے ناراض تھے کہ انھوں نے شاہ صاحب کا رد کیا تھا۔ اور مولانا فضل حق کے سلسلے میں لوگوں کو بدگمان کرنے کی ناکام کوشش ہے۔

لطف یہ ہے کہ یہی نواب صاحب جو رڈ وہابیت پر مولانا فضل حق سے اس درجہ برہم تھے خود

وہابیہ خصوصاً وہابیۂ ہند سے مسلسل اظہار برأت کرتے رہے۔ اور بقول مولانا مسعود عالم ندوی:

''اہل نجد کی بھی کوئی برائی نہیں ہے جو انھوں نے اپنی کتابوں میں نہ کی ہو...... کچھ یہی حال اہل صادق پور (شاہ اسمٰعیل کے متبعین و مقلدینؒ) کے ساتھ ہے۔'' (ماہنامہ معارف اعظم گڈھ۔ جلد ۵۱۔ شمارہ ۳۔ مارچ ۱۹۴۳ء)

اور اس تبرّا کی توجیہ مولانا نے یہ کی ہے کہ وہ حکومت برطانیہ کے خوف سے خود کو وہابیانِ ہند سے بے تعلق دکھانا چاہتے تھے ورنہ دل سے نجد کی دعوت توحید کے معترف و ثنا خوان تھے۔ مولانا ندوی نے توقع ظاہر کی ہے کہ:

''جو لوگ ان کی زندگی کی الجھنوں سے واقف ہیں وہ انھیں معذور رکھیں گے۔ (ماہنامہ معارف اعظم گڑھ۔ شمارہ مارچ ۱۹۴۳ء)

دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ نواب صاحب نے اپنی منقولہ بالا عربی تحریر میں شاہ اسمٰعیل کو غازی و شہید لکھا ہے مگر اپنی کتاب ترجمان وہابیہ میں شاہ اسمٰعیل کے دامن سے ترغیبِ جہاد کے داغ دور کیے ہیں اور لکھا ہے کہ:

''انھوں نے اپنی کسی کتاب میں مسئلہ جہاد کا نہیں لکھا'' (ترجمانِ وہابیہ۔ ص ۵۰۔ ۵۴۔ مطبع محمدی لاہور۔ ۱۳۱۲ھ۔ مؤلفہ بھوپالی)

اور شاہ اسمٰعیل سے عقیدت اور ان کی اتباع سے تبرّی کی ہے۔ (ترجمانِ وہابیہ۔ ص ۱۲ تا ۱۵۔ مؤلفہ بھوپالی)

اور پوری کتاب میں کسی ایک جگہ بھی شاہ اسمٰعیل کے نام کے ساتھ شہید کا لفظ نہیں لکھا اور بہ تکرار لکھا ہے کہ غدر میں انگریزوں کے خلاف جو بھی ہنگامہ آرائی ہوئی اور فتوے لکھے گئے وہ سب مقلدین اور احناف کی شرارت تھی۔ وہابی اور اہل حدیث کا دامن اس بغاوت میں شرکت سے بالکل پاک ہے۔ (ترجمانِ وہابیہ۔ ص ۲۵۔ مؤلفہ بھوپالی)

منشی محمد جعفر تھانیسری سوانح احمدی میں لکھتے ہیں:

''مولوی فضل حق معقولی خیر آبادی جو اس زمانے میں حاکم اعلیٰ، شہر کے سررشتہ دار اور علم منطق کے پتلے اور افلاطون و سقراط و بقراط کی غلطیوں کی

تصحیح کرنے والے تھے مولانا شہید کے سخت مخالف ہو گئے۔ چنانچہ کتاب تقویۃ الایمان کے اس مسئلے پر کہ "اللہ رب العزت، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سا دوسرا پیدا کر دینے پر قادر ہے۔" انھوں نے سخت اعتراض کیا اور لکھا کہ "اللہ رب العزت حضرت صلی علیہ وسلم جیسا دوسرا پیدا کرنے پر ہرگز قادر نہیں۔" اس کے جواب میں مولانا (اسمٰعیل) نے ایک فتویٰ بدلائلِ عقلی و نقلی مدلل لکھا ہے.........اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس خوبی سے آپ نے مخالفوں کا منہ بند کیا ہے۔ (سوانح احمدی۔ ص ۳۰۴۔ طبع کراچی ۱۹۶۸ء)

مخالفین کا منھ تو بند نہیں ہوا۔ دین میں جو فتنہ پیدا ہو گیا اور قلب امت میں قادیانیت کا جو ناسور پیدا ہو گیا اس کا علاج نظر نہیں آتا۔

شاہ اسمٰعیل کی اس تحریر پر مولانا فضل حق خیر آبادی نے یہ اعتراض کیا تھا کہ نظیرِ نبی ﷺ کا امکان تسلیم کر لینے سے ختم نبوت کا انکار لازم آتا ہے۔ مگر شاہ اسمٰعیل صاحب کو اپنی بات پر اِصرار رہا۔ اور پھر ان کی حمایت میں مولوی حیدر علی رام پوری نے ان سے بھی بڑھ کر بات کہی کہ حضور اکرم ممکن ہے ان (ہمارے) ارض و سما کے خاتم النبین ہوں اور وہ مفروض مثیلِ خاتم النبین کسی دوسرے ارض و سما اور کسی اور دنیا کا خاتم النبیین ہو۔ (صیانۃ الناس من وسوسۃ الخناس مؤلفہ حیدر علی رام پوری)

ان حضرات نے اثرِ ابن عباس سے استدلال کیا جو ایک موضوع روایت اور از قبیل اسرائیلیات ہے۔ اس روایت میں سات زمینوں کے وجود اور ان ساتوں زمینوں میں ہماری زمین کے انبیا اور خاتم النبیین کی طرح الگ الگ ہر زمین میں دوسرے انبیا اور خاتم النبیین کا ذکر ہے۔ گویا اس طرح یہ حضرات امکانِ نظیر کے اثبات کی دُھن میں سات زمینوں کے سات خاتم النبیین ثابت کرنے پر تل گئے۔ اور اس طرح دانستہ یا نادانستہ ہی انکار ختم نبوت کی راہ ہموار ہوئی۔ اور مرزا غلام احمد قادیانی کو یہ جرأت ہوئی کہ وہ نبوت کا اِدعا کرے۔ (مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ۱۸۷۳ء میں رسالہ "تحذیر الناس" لکھا اور ۱۸۸۰ء میں مرزا قادیانی نے اپنے مُلھم و مجدد ہونے کا دعویٰ کیا)۔ چنانچہ مرزا کے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود نے مولانا محمد قاسم نانوتوی کے

رسالہ تحذیر الناس کی (جواثر ابن عباس کی صحت کے حق میں ہے) ایک عبارت نقل کر کے لکھا ہے۔

"اہل بصیرت کے نزدیک اس شہادت کو خاص وزن حاصل ہونا چاہیے۔ یہ شہادت مدرسۃ العلوم دیوبند کے نامور بانی مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی (وصال ۱۸۸۹ء) کی ہے۔" (ختم نبوت کی حقیقت۔ ص ۱۵۴۔ طبع کراچی)

مختصر یہ ہے کہ شاہ اسمٰعیل کے غیر محتاط انداز بیان اور ایک خاص گروہ کے علما کی طرف سے ان کی بے جان اور ناحق حمایت نے ایک ایسے فتنے کو سر اٹھانے اور پنپنے کا موقع دیا جو ۹۵ سال سے امت کے لئے دردِ سر بلکہ دردِ جگر بنا ہوا ہے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کی فراست نے برمحل اس فتنے کا سدّ باب کرنا چاہا تھا اور شاہ اسمٰعیل کی کتاب پر بروقت تنقید کی تھی۔

جعفر تھانیسری نے مولانا فضل حق پر ایک اور تہمت یہ تراشی ہے کہ مولانا نے جامع مسجد دہلی میں شاہ اسمٰعیل کا وعظ بند کرا دیا تھا۔ (سوانح احمدی۔ ص ۳۵۔ طبع کراچی)

جعفر تھانیسری نے یہ بات بلا سند لکھی ہے اس لئے قطعاً ناقابل اعتبار ہے۔ وہ شاہ اسمٰعیل کی "موت" (۱۸۳۱ء) کے ایک سال بعد پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۹۵ء میں یہ سوانح لکھ رہے ہیں۔ (یہ سالِ طباعت ہے۔ تالیف دو ایک سال قبل کی ہوگی) اس لئے بغیر کسی سند کے اس کی بات کا اعتبار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ خصوصاً اس لئے کہ تحریک جہاد کے معاصر مؤرخین میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں لکھا کہ شاہ اسمٰعیل کے وعظ کی مخالفت میں مولانا فضل حق کا ہاتھ تھا۔

مولانا فضل حق کے ایک اور کرم فرما مرزا حیرت دہلوی تھے۔ ان حضرات نے شاہ اسمٰعیل کے سوانح پر حیات طیبہ کے نام سے جو کتاب بیسویں صدی کے آغاز میں تحریر کی تھی اس میں متعدد مقامات پر مولانا فضل حق کا ذکر کیا ہے۔ اور متعدد گھناؤنے اور بے بنیاد الزامات مولانا پر لگائے ہیں اور کئی غلط بیانیاں کی ہیں۔

مولانا فضل حق "زمرۂ علمائے دینی کے پابند نہیں تھے۔" اور "انھوں نے اپنے کو دائرۂ علما سے خارج کر لیا تھا۔" (حیات طیبہ۔ ص ۱۰۱۔ طبع سوم لاہور ۱۹۵۸ء)

اس سلسلے میں ہم آپ کو نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کا وہ قول یاد دلائیں گے کہ "مولانا فضل حق کی وضع قطع امرا کی سی تھی علما کی سی نہیں تھی۔" اور ہمارا جواب یہاں بھی وہی ہوگا جو ہم

نواب صاحب کی بات کا دے چکے ہیں۔

یہاں ہم آپ کو اپنی وہ بات بھی یاد دلائیں گے کہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے متعلق ایسی تہمتیں زیادہ تر اہل حدیث کے گروہ نے تراشی ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں نواب صدیق حسن خاں، منشی جعفر تھانیسری اور مرزا حیرت دہلوی کے اندازِ تہمت تراشی میں کس قدر یکسانی اور یک رنگی ہے؟ مرزا حیرت بھی اہل حدیث اور عدم تقلید کے مبلغ تھے۔

منشی جعفر تھانیسری کا یہ الزام مرزا حیرت دہلوی نے بھی دہرایا ہے کہ ''مولانا فضل حق نے شاہ اسمٰعیل کا وعظ بند کرادیا تھا''

بلکہ منشی جعفر کے اجمال کو تفصیل کا رنگ دے کر کئی صفحات سیاہ کیے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا نے پہلے تو ریزیڈنٹ کے کان میں یہ بات ڈالی کہ شاہ صاحب کے مواعظ سے امنِ عامہ میں خلل کا اندیشہ ہے۔ پھر ایک عرضی پندرہ سو مسلمانوں کے دستخط سے ریزیڈنٹ کو شاہ صاحب کے خلاف دلوائی جس پر ریزیڈنٹ نے حکم دے دیا کہ شاہ صاحب کا وعظ بند کر دیا جائے۔

شاہ صاحب تک یہ حکم پہنچا تو انھوں نے اس کے جواب میں ایک ایسی درخواست لکھی جس سے ریزیڈنٹ کی رائے بدل گئی اور اس نے اجراءِ مواعظ کا حکم دے دیا۔ مگر مولانا نے یہ حکم شاہ صاحب کو نہیں پہنچایا۔ شاہ صاحب چند روز انتظار کے بعد خود ریزیڈنٹ کے پاس پہونچ گئے اور اپنی درخواست کے جواب کا مطالبہ کیا۔ ریزیڈنٹ کو یہ معلوم کر کے کہ اس کا حکم شاہ صاحب تک نہیں پہنچایا گیا بہت طیش آیا اور اس نے مولانا کو زجر و توبیخ کی اور تین ماہ کے لئے معطل کر دیا۔ (حیات طیبہ۔ ص ۱۳۳۔ مرزا حیرت دہلوی)

اس کے جواب میں اولاً تو ہم پھر اپنا وہی مطالبہ دہرائیں گے کہ آپ کا ماخذ کیا ہے؟ ثانیاً مرزا حیرت نے لکھا ہے کہ جس سال یہ واقعہ پیش آیا'' یہ مولانا کی عمر کا بتیسواں سال تھا''۔ (ایضاً۔ ص ۱۲۴)

شاہ اسمٰعیل کا سال ولادت ۱۱۹۳ھ ہے۔ اس لئے ۱۲۲۵ھ میں ۳۲ سال کے ہوں گے۔ اور مولانا فضل حق کا سال ولادت ۱۲۱۲ھ ہے۔ اس وقت صرف تیرہ سال کے ہوں گے۔ یا یوں سمجھیے کہ شاہ اسمٰعیل مولانا سے ۱۹ سال بڑے تھے۔ اس لئے جب شاہ صاحب ۳۲ سال کے ہوں گے اس وقت مولانا کی عمر ۱۳ سال ہوگی۔ اس عمر میں وہ زیر تعلیم تھے نہ کہ ریزیڈنٹ کے سررشتہ دار۔

مرزا حیرت نے لکھا ہے کہ مولانا فضل حق کی نظم ونثر پر مولوی امیر احمد صاحب مرحوم نے تیرہ سو اعتراض کیے تھے۔ اور مولانا سید احمد رام پوری نے ان ۱۳ سو اعتراضات کو ایک رسالے کی صورت میں مرتب کر کے اس کا نام تیرہ صدی رکھا تھا۔ (ایضاً۔ ص ۱۰۰)

مرزا حیرت کا یہ بیان اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقت میں مبالغے کا عنصر شامل کر دینے میں چابک دست واقع ہوئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک اہل حدیث عالم شمس العلما مولوی امیر احمد سہسوانی نے مولانا فضل حق کی کتاب الہدیۃ السعیدیہ وغیرہ پر دس اعتراضات "تلك عشرة كاملة" کے نام سے ایک رسالہ میں لکھے تھے۔ اور مولوی سید محمد نذیر نے رام پور میں یہ رسالہ طبع کرایا تھا۔ (حیاۃ العلما۔ ص ۷۷۔ مؤلفہ مولانا عبدالباقی سہسوانی۔ طبع ۱۹۲۲ء)

دس کو تیرہ سو لکھ کر مرزا حیرت نے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کی تحریر میں صداقت کا عنصر ۱/۳۰۰ ہوتا ہے۔ دہلی کے نامور ثقہ بزرگ ملا واحدی تحریر فرماتے ہیں:

> "مرزا حیرت وہی بزرگ ہیں جنھوں نے سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے کارنامۂ شہادت سے انکار کیا تھا۔ اور انکار پر ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔ کمال یہ تھا کہ جس زمانے میں انکارِ شہادت پر کتاب تصنیف کر رہے تھے اس زمانے میں جمعہ کے جمعہ شہادت پر تقریریں کیا کرتے تھے۔ اور ایسی تقریریں کرتے تھے کہ سننے والوں کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔
> (میرے زمانے کی دلی۔ ص ۱۸۸۔ مؤلفہ ملا واحدی)

خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:

> "وہ (مرزا حیرت) فرضی عبارتیں، فرضی حکایتیں اور فرضی حوالہ جات تاریخ کی کتابوں میں درج کر دینے میں مشہور ہیں۔ اور ان کی دلیری اور جھوٹ بولنے اور جھوٹ لکھنے کی بے باکی پر شمس العلما علامہ شبلی نعمانی تک حیرت زدہ رہتے تھے۔" (غدر دہلی کے اخبار۔ ص ۶۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۲۳ء)

خواجہ صاحب کے اس بیان کا جیتا جاگتا ثبوت مرزا حیرت کی کتاب حیات طیبہ ہے۔ اس کتاب کے ماخذ کی اصلیت و واقعیت کا یہ حال ہے کہ متعدد مقامات پر تو اس نوع کے مہمل و مجمل حوالے ہیں۔ "ایک کتاب" (ص ۷۰، ۴)، "ایک راوی" (ص ۹۰)، "ہم عصر مورخ"

(ص ۱۸۸)، ''ہم عصر سوانح نویس'' (۲۷۷)، ''ایک ضعیف بوڑھا شخص مرحوم'' (ص ۲۹۵، ''ہمارا مؤرخ'' (ص ۶۱) ایک اہم ماخذ منشی ہیرالال کے بیانات ہیں۔ پانچ اہم مواقع پر اس کے حوالے دیئے ہیں۔ اور اسے شاہ اسمٰعیل کا منشی بتایا ہے۔ (ص ۱۲۳) شاہ صاحب کے کئی صفحات پر محیط مواعظ و مکالمات اس کی روایت سے نقل کیے ہیں۔ حالاں کہ شاہ صاحب کے کسی تذکرے میں یہ نام ہماری نظر نہیں گذرا۔ اسی طرح چند ایسی کتابوں کے حوالے بھی اس کتاب میں نظر سے گذرے جن کے نام بھی کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئے۔ مثلاً سیر دہلی (۵ مقامات پر) تذکرۂ مشاہیر دہلی (۳ مقامات پر)، تواریخ علمائے دہلی (۳ مقامات پر) مجموعۂ واقعات (۲ مقامات پر) تحفۂ عزیزی (۳ مقامات پر)

بکثرت انکشافات بھی کیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ شاہ اسمٰعیل نے ''حقیقت تصوف'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔ جو مرزا صاحب نے کشمیر میں دیکھی بھی تھی (ص ۱۶۷) شاہ اسمٰعیل کے معاصر مؤرخ کتنے بے خبر تھے کہ انھوں نے شاہ صاحب کی ایک ضخیم کتاب کی زیارت نہیں کی۔

حکیم سید عبدالحیٔ حسنی رائے بریلوی (مؤلف نزہۃ الخواطر) نے ۱۸۹۴ء میں سرگروہ اہل حدیث میاں نذیر حسین دہلوی کی زبانی ایک روایت سن کر اپنے سفرنامے (دہلی اور اس کے اطراف) میں من وعن، بے نقد و جرح درج کردی تھی۔ یہ روایت بھی اسی مہم کا ایک حصہ ہے۔ جس کے ذریعہ مولانا فضل حق کے دامنِ کردار پر معائب کی افشاں چھڑکی جارہی ہے۔ پہلے آپ روایت سن لیں۔ میاں نذیر حسین نے سید عبدالحیٔ سے فرمایا:

> ''مولانا فضل حق صاحب ایک شادی میں شریک تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ پلاؤ کھایا ہوگا؟ ناچ رنگ ہوتا رہا۔ جس مکان کے بالاخانے پر یہ جلسہ تھا وہاں جتنے ظرف پانی کے تھے سب میں کسی نے جمال گوٹہ ملادیا۔ اور آمد و شد کا راستہ بند کردیا یعنی زینے کے دروازے میں باہر سے قفل لگادیا۔ وہاں پلاؤ کھانے کی وجہ سے پیاس کی شدت سے لوگ خوب پانی پیتے رہے اور دست آنے شروع ہوئے۔ حاضرین و ارباب نشاط سب اس مصیبت میں مبتلا ہوگئے۔ راستہ بند ہونے سے اور پریشانی پھیلی۔ وہیں سب اپنی اپنی حالت میں تھے اور شدت گرمی سے پانی پیتے جاتے

تھے۔ کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ اس پانی میں زہر گھلا ہوا ہے۔ رات کو جو پولیس کے جوان روند میں ادھر آ نکلے تو شور وغل سن کر اوپر چڑھے۔ دروازہ توڑا تو لوگوں کی یہ حالت دیکھی۔ ان میں مولوی (فضل حق) صاحب بھی تھے۔ جیسی کچھ خفت ان کو ہوئی وہ ظاہر ہے۔'' (دہلی اور اس کے اطراف۔ ص ۲۱۔ مؤلفہ حکیم عبدالحئ رائے بریلوی)

میاں نذیر حسین کتنے ہی ثقہ راوی کیوں نہ ہوں، عقل اسے باور کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اور درایت کا فیصلہ یہ ہے کہ ایک ان ہونی بات ہے۔ کہانی ہے۔ فسانہ ہے۔ حقیقت نہیں ہے۔ اگر ہم روایت کو حقیقت پر مبنی فرض کریں گے تو اس کے ساتھ متعدد مفروضات کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔

سب سے پہلے تو ہمیں اکبر شاہ ثانی کی دلی میں شاہ عبدالعزیز کے دور کی دلی میں اور غدر سے ۳۰ سال پہلے کی دلی مین ایک ایسا شریف النفس اور باہوش میزبان فرض کرنا ہوگا جو اپنی اولاد کی شادی میں مدعو معززین کے ساتھ ایسا گھناؤنا، پرخطر اور ناشائستہ مذاق کرسکتا ہو۔ یا دوسرے مذاق کرنے والے ''شرفا'' کے ساتھ اس حد تک اِغماض کرسکتا ہو کہ وہ اس کے معزز مدعوین کے ساتھ جو چاہیں معاملہ کریں۔ اور خود جا کر بستر پر دراز ہو جائے۔ پھر ایک ایسا بالا خانہ فرض کرنا ہوگا۔ جو

اولاً: اتنا وسیع ہو کہ اس میں سرود وغنا کی محفل برپا کی جاسکے۔

ثانیاً: موسم گرما میں ایسی محفل کے لئے بھی موزوں ہو، ہوادار ہو۔

ثالثاً: اس میں آمد ورفت کا صرف ایک راستہ ہو جسے مقفل کردیا جائے تو وہ بالا خانہ دنیا سے منقطع ہو جائے۔

رابعاً: وہ کسی دوسری عمارت سے متصل نہ ہوتا کہ اس میں محبوس ومحصور حضرات کی آواز بھی برابر والے سن نہ سکیں۔

خامساً: اس میں کوئی دریچہ اور روشن دان تک نہ ہو کہ اس کے ذریعہ محلے والوں سے رابطہ قائم کیا جاسکے اور استعانت کی جاسکے۔

پھر یہ بھی فرض کرنا ہوگا کہ ان شرکاء بزم نشاط میں سے ہر فرد بلا استثنا اتنا قوی الاعضاء بلکہ سخت جان تھا کہ شدید موسم میں پلاؤ کھانے کے بعد جمال گوٹے کا محلول گھنٹوں مسلسل پیتا رہے

اور مبتلائے اسہال رہے مگر ان میں سے ایک فرد کے بھی جان وتن کا رشتہ منقطع نہیں ہوا۔ بس صرف مولوی فضل حق صاحب کو خفت ہو کے رہ گئی۔

حکیم سید عبدالحیٔ رائے بریلوی نے نزہۃ الخواطر کے جزء سابع میں بھی مولانا فضل حق کے ساتھ اپنے تعلقِ خاطر کا ثبوت دیا ہے۔ اور نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کے تنقیصی کلمات نقل کرنے کے سوا خود بھی لکھا ہے کہ:

"ان کی وضع قطع علما کی سی نہیں تھی۔ امرا کی سی تھی۔ شطرنج کھیلنے اور مزامیر سننے اور مجالسِ رقص میں شرکت اور دوسری ممنوع باتوں سے بھی پرہیز نہیں کرتے تھے۔ (نزہۃ الخواطر۔ الجزء السابع۔ ص ۲۷۵)

آپ کو یاد ہوگا کہ وضع قطع کی بات نواب صدیق حسن بھوپالی سے منقول ہے۔ اور سماع مزامیر اور مجالس رقص میں شرکت کا اتہام میاں نذیر حسین دہلوی کے معمل (کارخانہ، فیکٹری میں ڈھالا گیا ہے۔ اور ہم ان کا جواب دے چکے ہیں۔ اور یہ ثابت کر چکے ہیں کہ یہ باتیں حقیقت نہیں تہمت ہیں۔ اس کے برعکس علامہ کے تلمیذ مولانا عبداللہ بلگرامی کا بیان ہے کہ:

"ہر ہفتے قرآن کریم کا ختم فرماتے۔ تہجد کی نماز پابندی سے پڑھتے اور جو نوافل کا اتنا اہتمام کرتا ہو اس کے ادائے فرائض کا خود اندازہ کرلو۔" (خطبۂ ہدیہ سعیدیہ)

مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

"مولوی فضل حق صاحب، مرزا (غالبؔ) کے بڑے دوست تھے۔ ایک دن مرزا ان کی ملاقات کو گئے۔ ان (مولانا) کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آیا کرتا تو خالقِ باری کا یہ مصرع پڑھا کرتے تھے "بیا برادر آو رے بھائی۔" چنانچہ مرزا صاحب کی تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے اور یہی مصرع کہہ کر بٹھایا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ مولوی فضل حق صاحب کی رنڈی بھی دوسرے دالان سے اٹھ کر پاس آن بیٹھی۔ مرزا نے فرمایا۔ ہاں صاحب! اب وہ دوسرا مصرع بھی فرما دیجیے۔ "بنشیں مادر بیٹھ ری مائی۔" (آب حیات۔ ص ۴۲۷)

اس لطیفہ کا صحیح واقعہ مرزا غالبؔ کی بہن کے پوتے نواب سرور جنگ نے اپنی خود نوشت میں اس طرح درج کیا ہے۔

"مرزا غالبؔ کی مولانا فضل حق سے کمالِ دوستی تھی۔ ہر شب کو معمولاً مرزا مولانا کے پاس

جایا کرتے تھے۔ایک شب کو مولانا جو سررشتہ دار ریزیڈنٹ تھے باہر صحن میں بیٹھے ہوئے کچھ مسلیں دیکھ رہے تھے۔ایک رنڈی بھی اس امر کی منتظر کہ مولانا دیکھ لیں تو سلام کر کے بیٹھ جاؤں، کھڑی ہوئی تھی۔اس عرصے میں مرزا بھی لالٹین لیے آگے آگے پہنچے۔مولانا نے سر اٹھا کر کہا کہ "بیا برادر آورے بھائی" مرزا نے کہا دوسرا مصرع بھی پڑھ دیجیے کہ دیر سے منتظر کھڑی ہے۔دوسرا مصرع یہ ہے "بنشیں مادر بیٹھ ری مائی" (کارنامۂ سروری۔ص ۳۷۔بحوالہ غالب نام آورم از نادم سیتاپوری مطبوعہ لاہور)

ہنومان گڑھی (اجودھیا) کی مسجد بابری کی بے حرمتی کے سلسلے میں ۱۸۵۵ء میں مولوی امیر علی امیٹھوی (امیٹھی، لکھنؤ) کی قیادت میں مسلمانوں نے جو جہاد کیا تھا، بعض مورخین کا بیان ہے کہ مولانا فضل حق اس جہاد کے عدم وجوب کا فتویٰ دینے والے علما میں شامل تھے۔لیکن یہ واقعہ نہیں ہے۔ یہ الزام صرف سید کمال الدین حیدر (عرف سید محمد زائر) نے عائد کیا ہے جو انگریزوں کے خاص آدمی تھے۔اور جنھوں نے مسٹر الیٹ (مشہور مؤرخ) کی فرمائش پر اودھ کی تاریخ "قیصر التواریخ" مرتب کی تھی۔اور اسی تاریخ کی بنا پر وہ واجد علی شاہ کے معتوب اور ملازمت سے برطرف ہوئے تھے۔اور اسی الزام کو مولوی نجم الغنی خاں رام پوری نے برسوں بعد اپنی تاریخِ اودھ (مطبوعہ ۱۹۱۹ء) میں من وعن نقل کر دیا۔

مسجد پر ہندوؤں کے قبضے اور قرآن کریم کی بے حرمتی کے خلاف جب جہاد کی تحریک شروع ہوئی۔اودھ کی حکومت نے اس کی مزاحمت کے لئے علما کی خدمات حاصل کیں اور ایک استفتا مرتب ہوا۔جس کے جواب میں علما نے مجاہدین کے مقابلے میں حکومت کے نقطۂ نظر کی تائید کی۔ اس فتویٰ پر دستخط کرنے والے علما میں سید کمال الدین حیدر نے مولانا فضل حق کا بھی نام لیا ہے۔ (ص ۱۲۵۔قیصر التواریخ۔جلد دوم طبع ۱۹۰۷ء)

مگر لطف یہ ہے کہ اسی کتاب میں ص ۱۱۰ پر جہاں وہ فتویٰ نقل کیا ہے اس پر مولوی محمد یوسف ،مولوی احمد اللہ، مولوی خادم احمد، مولوی محمد سعد اللہ، مولوی تراب علی کے دستخط ہیں۔ مولانا فضل حق کے نہیں ہیں۔مولوی نجم الغنی خاں نے بھی تاریخ اودھ میں یہ فتویٰ نقل کیا ہے مگر یہاں بھی مولانا کے دستخط نہیں ہیں۔

حدیقۃ الشہداء میں بھی جو مولوی امیر علی امیر المجاہدین کے ایک رفیق کی تالیف ہے اور

اسی سال شائع ہوئی تھی۔ (واجد علی شاہ اوران کا عہد۔ مؤلفہ رئیس احمد جعفری میں یہ پوری کتاب نقل کردی گئی ہے۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۷ء) علما کے فتوے درج ہیں لیکن مولانا فضل حق کا نہ فتویٰ ہے نہ دستخط۔

پھر آخر مؤلف قیصر التواریخ کا یہ بے اصل بیان کیسے تسلیم کرلیا جائے؟ خصوصاً جب کہ انھیں کی اسی کتاب میں فتویٰ پر مولانا کے دستخط نظر نہیں آتے؟

ایک اور معاصر مؤرخ مولوی سید فخر الدین نے مہر جہاں تاب میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے مگر انھوں نے بھی مولانا فضل حق کا نام نہیں لیا۔

حدیقۃ الشہداء میں یہ ضرور درج ہے کہ حکومت نے اس سلسلے میں ایک پنچایت بنائی جس کے چار ثالث مقرر کیے تھے۔ ان میں سے ایک مولانا فضل حق بھی تھے۔ مگر حکومت نے اس پنچایت کی کوئی میٹنگ ہی نہیں بلائی۔ اس لئے اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مولانا فضل حق کا اس سلسلے میں کس طرف رجحان تھا۔ (ملخص۔ ص۱۰۲ تا ۱۲۸۔ فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء۔ مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی)۔ طبع اول برکات اکیڈمی، لیاقت آباد، کراچی، مئی ۱۹۷۵ء۔)

☆☆☆☆☆☆

انقلاب کی کہانی! قائدِ انقلاب کی زبانی

"الثورۃ الھند" اور "قصائد فتنۃ الھند" (قصیدۂ ہمزہ ودالیہ) تاریخ انقلاب کے مستند حقائق وواقعات وتاثرات وحالات پر مشتمل وہ اجمالی دستاویز ہے جو انقلاب ۱۸۵۷ء میں شریک بلکہ اس کے اہم ترین قائد علامہ فضل حق خیر آبادی کے زرخیز ذہن اور فکر انگیز قلم کا ایک نادر اور معیاری نمونہ ہے۔

مولانا عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی سابق اسسٹنٹ لائبریرین شعبۂ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ (متولد جنوری 1915ء۔ متوفی ۱۴ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۸ر فروری ۱۹۸۴ء) نے پہلی بار الثورۃ الھندیۃ (منثور) اور قصائد فتنۃ الھند (منظوم) کا اردو ترجمہ کر کے اسے اپنی تاریخی کتاب "باغی ہندوستان" میں مع عربی متن شامل کیا جو اس کتاب کا اصل سرمایہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مقدمہ کے ساتھ مدینہ پریس بجنور سے ۱۹۴۷ء میں اس کی پہلی طباعت واشاعت ہوئی۔

باغی ہندوستان مؤلفہ عبدالشاہد شیروانی کے طبع چہارم (مبارک پور اعظم گڑھ ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء) کی تقدیم میں مولانا سید نجم الحسن رضوی خیر آبادی لکھتے ہیں۔

"راقم السطور نے الثورۃ الھندیۃ کی زیارت سب سے پہلے استاذ محترم مولانا معین الدین اجمیری (شاگرد رشید حکیم سید برکات احمد ٹونکی) کے کتب خانہ میں کی تھی۔ یہ نسخہ بخطِ نسخ

مولانا نے خود نقل کیا تھا اور لغت کی کتابوں کی مدد سے حلِ لغات کیا تھا۔ موصوف کا ارادہ یہ تھا کہ عربی ادب میں استعداد پیدا کرنے کے لئے مجھ کو اور مولوی عبدالشاہد شیروانی کو سبقاً سبقاً پڑھادیں لیکن دوسری کتابوں کا بار اتنا تھا کہ اس کی نوبت نہ آسکی۔ بعد میں یہ نسخہ استاذِ محترم نے شاہد میاں کو دے دیا تھا۔ (ص ۷۔ تقدیم باغی ہندوستان طبع چہارم مبارک پور ۱۹۸۵ء)

مولانا عبدالشاہد شیروانی نے ۱۹۴۵ء میں الثورۃ اور قصائد کا عربی سے اردو ترجمہ کیا تھا۔ اسی درمیان انھیں ایک اور نسخہ دست یاب ہوا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ایک نسخہ مولانا ہدایت اللہ خاں جون پوری شاگرد رشید علامہ فضل حق خیر آبادی کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا بھی دست یاب ہو گیا۔ یہ نسخہ مولانا سید سلیمان اشرف صاحب سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (شاگرد مولانا ہدایت اللہ جون پوری) کی دوسری مخصوص کتابوں کے ساتھ حبیب گنج (علی گڑھ) پہنچ گیا تھا۔ جو کتابت کے لحاظ سے دوسرے نسخوں سے قدیم و صحیح ثابت ہوا۔ (ص ۱۸۔ مقدمہ طبع اول باغی ہندوستان)

ایک جگہ مزید تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں:

۳۶ اور ۴۲، اوراق کے دو قصیدے اور قصائد فتنۃ الھند سبحان اللہ اورینٹل کلکشن، لٹن لائبریری، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہیں۔ دو بیاضیں مولوی شاہ ولایت احمد لاہر پوری سجادہ نشین آستانہ قلندریہ کے کتاب خانہ میں اور کلام کا کچھ حصہ جس میں اصل مسودہ بھی شامل ہے کتاب خانہ مفتیانِ گوپامئو میں ہے۔

ایک نامکمل بیاض جس میں عربی میں مختلف بزرگوں اور دوستوں کے نام چھ خطوط اور پندرہ طویل قصیدے ہیں جن میں اکثر مکمل اور بعض نامکمل ہیں محبِّ محترم مولوی نصیر الدین اجمیری برادر زادۂ مولانا معین الدین اجمیری کے پاس ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ بعض قصائد و خطوط خود علامہ ہی کے دستِ مبارک کے لکھے ہوئے ہیں۔ کئی جگہ دستخط بھی ثبت ہیں۔ اس بیاض کی نقل اور رسالہ الثورۃ الھندیۃ مع قصائد فتنۃ الھند حضرت الاستاذ علامہ معین الدین اجمیری کے ہاتھ کے لکھے ہوئے میرے پاس بھی ہیں۔

رسالہ ''الثورۃ الھندیۃ'' مع ''قصائد فتنۃ الھند'' کتاب خانہ حبیب گنج (علی گڑھ) کتاب خانہ ٹونک اور کتاب خانہ مولوی سید نجم الحسن رضوی خیر آبادی میں بھی موجود ہے۔ (حاشیہ۔ ص ۱۶۵۔ طبع چہارم باغی ہندوستان)

یہ رسالہ جزیرۂ انڈمان سے ہندوستان کس طرح پہنچا؟ اس تعلق سے مولانا شیروانی لکھتے ہیں:

''جب حضرت مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی (استاذِ مفتی لطف اللہ علی گڑھی) ایک انگریز افسر کی فرمائش پر ''تقویم البلدان'' کا ترجمہ کر کے ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء میں رہائی پا کر عازم ہندوستان ہوئے تو یہ رسالہ علامہ فضل حق خیر آبادی نے اپنے خلف الرشید مولانا عبدالحق خیر آبادی کے پاس مختلف کاغذ کے پرزوں اور کپڑوں پر کوئلہ وغیرہ سے لکھ کر بھیج دیا تھا۔ اسی رسالہ کے ساتھ قصائد فتنۃ الھند بھی تھے۔

مولانا عبدالحق خیر آبادی نے بڑی محنت و کاوش سے اسے مرتب کیا اور چند مخلصین و معتقدین نے اس کی نقلیں حرزِ جاں بنا کر اپنے پاس رکھیں۔ اس طرح اس کے نسخے خاص خاص حضرات کے پاس محفوظ ہو گئے۔ حکومت کے خوف سے کسی نے اس کے عام کرنے کی کوشش نہ کی نہ کوئی چھپوانے کی جرأت کر سکا۔ میرے استاذ محترم مولانا معین الدین اجمیری (۱۲۹۹ھ۔ ۱۳۵۹ھ) نے کئی بار ارادۂ اشاعت کیا لیکن کل امر مرھونٌ باوقاتھا کے مطابق پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ (ص ۱۶۔ مقدمہ طبع اول باغی ہندوستان)

''رسالہ مع قصائد علامہ نے مفتی عنایت احمد کاکوروی کے ذریعہ ۱۲۷۷ھ میں خلف الصدق مولانا عبدالحق کے پاس بھیجا تھا کہ ابّن میاں کو جا کر یہ تحفہ دے دینا۔ پنسل اور کوئلہ سے لکھے ہوئے مختلف پرچے تھے جن کو کئی ماہ کی محنت کے بعد (مولانا عبدالحق) درست اور مرتب کر پائے تھے۔ (ص ۲۲۶۔ باغی ہندوستان۔ طبع چہارم)

قصائد فتنۃ الھند (قصیدۂ ہمزیہ و دالیہ) زیر نظر کتاب (قائد جنگِ آزادی) میں شامل نہیں ہے۔ الثورۃ اور قصائد مع اصل عربی اور اردو ترجمہ کے مطالعہ کی ضرورت جو قارئین کرام محسوس کریں وہ باغی ہندوستان مؤلفہ عبدالشاہد شیروانی مطبوعہ لاہور و مبارک پور کی طرف رجوع کریں۔ باغی ہندوستان میں یہ دونوں چیزیں وہاں ایک ساتھ مطالعہ کی جا سکتی ہیں۔

علامہ فضل حق خیر آبادی قصائد فتنۃ الھند کے آخر میں لکھتے ہیں:

قد تمتِ القصیدتان فی شهر رجب سنة ۱۲۷٦ھ. یعنی الفاً و مائتین و ستاً و سبعین من الهجرة النبویة علیٰ صاحبها ازکی الصلوٰة و التحیة.

وانـا محبوس فی الجزیرة الوبیة. نجانی اللّٰه سبحٰنه منها برحمتهٖ الوسیعة و قدرتهٖ البدیعة. بجاهِ حبیبهٖ و اٰلهٖ و عِتُرتهٖ، علیه و علیهم ازکیٰ الصلوٰت و اسنیٰ التسلیمات.

(ص۱۸۸۔ باغی ہندوستان)

مولانا ابوالکلام آزاد الثورة الهندیة کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا فضل حق رحمۃ اللہ علیہ کا یہ رسالہ اہل علم میں متداول تھا لیکن آج تک اس کی طباعت کا سروسامان نہ ہوسکا.................. غدر کے حوادث کا تذکرہ اور پھر ایسے شخص کی زبانی جسے بجرمِ بغاوت مدۃ العمر قید کی سزادی گئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ خطرناک یقین کی جاتی تھی۔

والد مرحوم (مولانا خیر الدین دہلوی) نے معقولات کی تکمیل مولانا (فضل حق) مرحوم کی خدمت میں کی تھی اس لئے ان کی مصنّفات اور حالات سے خاص علاقہ رکھتے تھے۔ مولانا کے فرزند مولانا عبدالحق مرحوم نے یہ رسالہ خود اپنے قلم سے نقل کر کے والد مرحوم کو مکہ معظّمہ بھیجا تھا۔ چنانچہ وہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔

مولوی عبدالشاہد صاحب شیروانی نے جب مجھ سے اس رسالہ کی تصحیح واشاعت کے ارادہ کا ذکر کیا تو مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ اب ان کی کوشش سے نہ صرف اصل رسالہ پہلی مرتبہ شائع ہو رہا ہے بلکہ اس کا اردو ترجمہ بھی مہیا ہوگیا ہے۔ ترجمہ میں نے مختلف مقامات سے دیکھا۔ سلیس اور شگفتہ عبارت میں کیا گیا ہے اور اصل کی لفظی رعایت کے ساتھ اسلوب بیان کی شگفتگی اور روانی بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ امید ہے کہ عزیز موصوف کی یہ سعی مشکور ہوگی اور رسالہ عام طور پر مقبول ہوگا۔

ابوالکلام۔ دہلی ۲۱ راگست ۱۹۴۶ء

(ص۲۳۔ باغی ہندوستان مؤلفہ عبدالشاہد شیروانی)

ڈاکٹر سید معین الحق (کراچی) نے The Story of the War of Indepence کے نام سے الثورة الهندیة کا انگریزی ترجمہ کردیا ہے جو جلد پنجم جزء اول پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی میں شایع ہو چکا ہے۔

اب قارئین کرام الثورة الهندیة از علامہ فضل حق خیرآبادی کا اردو ترجمہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمام ثنائیں اس خدائے برتر کے لیئے ہیں جس سے بغیر کسی نا امیدی کے، محنت و آزمائش، کہنگی و بوسیدگی اور غم و تکلیف سے نجات دینے کی بہت بڑی امید وابستہ ہے۔ اور جو اسے اس کے اعلیٰ نام سے پکارے اسے بہترین عطایا اور بیشمار نعمتیں عطا فرمانے والا ہے۔ بالخصوص مظلوم و مضطر کی، اس کی مصیبتوں اور بیماریوں میں سننے والا ہے۔

سلام ہو اس خوش رو، خوش خبری سنانے والے اور ڈرانے والے پر جس کی تمام انبیائے کرام نوید مسرت آمد سناتے آئے۔ بلا و وباء کے دور کرنے، دشمنوں کے ظلم کے پردے چاک کرنے، بڑی بد بختی اور سخت بیماری سے نجات دلانے کی، گنہگاروں اور سیہ کاروں کو، اس کی شفاعت سے بڑی امید ہے۔

سلام ہو اس کی شریف و نجیب و کریم اولاد اور اس کے عظیم المرتبہ، شدید و رحیم اصحاب پر۔ خصوصاً پاکباز و صاف باطن خلفا پر۔ اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ان سب پر نازل ہوں جب تک فرشتے آسمان پر تسبیح و تہلیل کرتے رہیں۔ اور کشتیاں سمندر میں تیرتی رہیں۔

میری یہ کتاب، ایک دل شکستہ، نقصان رسیدہ، حسرت کشیدہ اور مصیبت زدہ انسان کی کتاب ہے۔ جو اَب تھوڑی سی تکلیف (جھیلنے) کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ اپنے رب سے جس پر سب کچھ آسان ہے، مصیبت سے نجات کا امیدوار ہے۔

جو ابتدائے عمر سے عیش و فراغت کی زندگی بسر کرنے کے باوجود، اب محبوسِ دام ظلم اور تباہ شدہ ہے اور مقبول دعاؤں کے ذریعہ خدا سے ازالۂ کرب کا طالب ہے۔ وہ بڑی مشکلات میں مبتلا اور ترشرو ظالموں کے ہاتھوں میں گرفتار ہے۔ ان ظالموں نے اسے اچھے لباس سے معرا کر کے غم و حزن کی وادیوں اور ایسے تنگ و تاریک قید خانوں میں ڈال دیا ہے جو سیاہ فتنوں کے مرکز ہیں۔

وہ محبوس و حزیں، سخت دل، اچکے، اور ظالم افراد پر نظر کرتے ہوئے اپنی رہائی سے مایوس ہے مگر اللہ کی رحمت سے نا امید نہیں ہے۔ وہ ایک سیدھا سادھا، نرم خو اور مریض و کمزور ہوتے ہوئے، شریر و بد فطرت کی قید میں ہے۔ اور ظالم و جابر، بد خلق و بد کردار کے مظالم سے حیران و پریشان ہے۔ وہ آفت رسیدہ، ایسے مصائب میں مبتلا ہے جن کی سختیوں تک قیاس کرنے والے کا قیاس نہیں پہنچ سکتا۔ اور ایسا مضطر و محتاج ہے جو سخت عذاب و احتباس میں گرفتار ہو چکا ہے۔

۔وہ سفید رو، سیاہ دل، متلون مزاج، ترشرو، کنجی آنکھ، گندم گوں بال والوں کی قید میں آچکا ہے۔ جس کا اپنا عمدہ لباس اتار کر موٹا اور سخت لبادہ پہنا دیا گیا ہے۔ جو اس وقت مجبور و عاجز ہے اور اپنے رب سے لو لگائے ہوئے ہے۔

اپنے تمام اعزہ واقارب سے دور اور بہت دور ہے۔ مدعی اور منازع کے بغیر اس پر فیصلہ صادر کر دیا گیا ہے۔ وہ اپنے ہم نشینوں اور خادموں کے سامنے شرمندہ ہے۔ اس کے بازوؤں کو سخت تصادم سے کمزور کر دیا گیا ہے۔ وہ غمزدہ، تنہا اور دور افتادہ ہے۔ اسے اپنی زمین و شہر سے جلاوطن اور اہل و عیال سے دور کر دیا گیا ہے۔ یہ سارا ظلم و ستم، ظالم بدکیش نے روا رکھا ہے۔ اسے اور اس کے اہل و عیال کو اپنی درندگی کی جھاڑی میں چھوڑ دیا ہے۔ اسے قید کر کے ہر ممکن مصیبت پہنچائی گئی ہے۔ اس کا قصور، صرف ایمان اور اسلام پر مضبوطی سے قائم رہنا اور علمائے اعلام میں شمار ہونا ہے۔

اس سے ان ظالموں کا مقصد نشانِ درس و تدریس کو مٹانا اور علم کے جھنڈے کو نیچے گرانا ہے۔ وہ صفحات قرطاس سے بھی نام و نشان مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس حادثہ فاجعہ (انقلاب ۱۸۵۷ء۔ شاہد شیروانی) کی وجہ سے ہوا ہے۔ جس نے آبادیوں کو ویران، اور مصیبتوں کی شور زمین کو شاداب بنا دیا ہے۔ جس سے غموں کے بادلوں سے کڑکتی ہوئی بجلیاں، مصیبت زدگانِ وطن پر گریں۔ اور ان پر بادشاہوں کو غلام و قیدی اور امراء کو محتاج و فقیر بنانے والی محتاجی و ناداری مسلط کر گئی۔

یہ داستانِ الم اس طرح ہے کہ وہ برطانوی نصاریٰ جن کے دل ممالکِ ہند کے دیہات و بلاد پر قبضہ، اور اس کے اطراف و اکناف و سرحدات پر تسلّط کے بعد عداوت و کینہ سے بھر گئے تھے۔ اور تمام ذی عزت اعیان کو ذلیل و خوار کر کے ان میں سے ایک کو بھی اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ سرِ نافرمانی کو جنبش دے سکے۔

انھوں نے تمام باشندگانِ ہند کو، کیا امیر کیا غریب، چھوٹے بڑے، مقیم و مسافر، شہری و دیہاتی سب کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کو نہ تو کوئی مددگار و معاون نصیب ہو سکے گا اور نہ انقیاد و اطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت ہو سکے گی۔

یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ سب لوگ انھیں کی طرح ملحد و بے دین ہو کر ایک ہی ملّت پر جمع

ہو جائیں۔ اور کوئی بھی ایک دوسرے سے ممتاز فرقہ نہ رہ سکے۔ انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے باشندوں کا اختلاف، تسلط وقبضہ کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوگا۔ اور سلطنت میں انقلاب پیدا کردے گا۔ اس لئے پوری جاں فشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب وملت کے مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکروحیلہ سے کام لینا شرع کیا۔ انھوں نے بچوں اور نافہموں کی تعلیم اور اپنی زبان ودین کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے۔ پچھلے زمانے کے علوم ومعارف اور مدارس ومکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔

دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقوں پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمینِ ہند کے غلہ کی پیداوار، کاشتکاروں سے لے کر نقد دام ادا کیے جائیں۔ اور ان غریبوں کو خرید وفروخت کا کوئی حق نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح بھاؤ کے گھٹانے بڑھانے، اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے وہ خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خدا کی مخلوق مجبور ومعذور ہو کر ان کے قدموں میں آپڑے۔ اور خوراک نہ ملنے پر ان نصاریٰ اور ان کے اَعوان وانصار کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔

ان ترکیبوں کے علاوہ ان کے دل میں اور بھی بہت سے مفاسد چھپے ہوئے تھے۔ مثلاً مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا، شریف وپردہ نشیں خواتین کا پردہ ختم کرانا۔ نیز دوسرے احکامِ دینِ مبین کو مٹانا۔ وغیر ذالك۔

اپنے مکر کی ابتدا اس طرح کی کہ سب سے پہلے اپنے ہندو مسلم لشکریوں کو ان کے رسوم واصول سے ہٹانے اور مذہب وعقائد سے گمراہ کرنے کے درپے ہوئے۔ ان کا گمان تھا کہ جب بہادر لشکری اپنے دین کو بدلنے اور احکامِ نصرانیت بجالانے پر آمادہ ہو جائیں گے تو پھر دوسرے باشندوں کو سزا وعقاب کے ڈر سے خود ہی مجالِ انکار نہ ہو سکے گی۔

انھوں نے ہندو لشکر کو جو تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ گائے کی چربی اور مسلمان سپاہیوں کو جو تھوڑی تعداد میں تھے سور کی چربی چکھانے پر زور ڈالا۔ یہ شرمناک روش دیکھ کر دونوں فرقوں میں اضطراب پیدا ہو گیا اور اپنے اپنے مذہب واعتقاد کی حفاظت کی خاطر ان کی اطاعت وانقیاد سے منھ موڑ لیا۔ ان کے اس اضطراب نے خرمنِ امن پر چنگاری کا کام کیا۔ گروہِ نصاریٰ کا قتل، ڈاکہ زنی، ان کے سرداروں اور سپہ سالاروں پر حملہ شروع کردیا۔ بعض لشکری حد سے تجاوز

کر گئے۔ انھوں نے قساوت قلبی اور شوریدہ سری کا انتہائی مظاہرہ کیا۔ بچوں اور عورتوں کے قتل سے بھی دریغ نہ کیا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں اور بے گناہ عورتوں کے قتل وغارت گری سے رسوائی و ذلت کے مستحق بن بیٹھے۔۔ پھر تمام ''باغی،، گروہِ لشکریاں، اپنی چھاؤنیوں سے، اپنے افسروں سے نبٹنے کے بعد چل کھڑے ہوئے۔ عاملوں اور حاکموں کے نظام درہم برہم ہو گئے۔ راستوں کے امن میں خلل وفتور، مخلوق خدا میں فتنہ وفساد، اور دیہات وبلاد مین شور وشغب پھیل گیا۔ طوفانِ حوادث جوش میں آ گیا۔

بہت سے لشکر شہر مشہور، بلد معمور، مسکنِ آلِ تیمور، دارالسلطنت دہلی جا پہونچے۔ وہاں پہنچ کران سب نے ایسے شخص کو سردار و پیشوا بنالیا جو اس سے پہلے بھی ان کا آمر و حاکم (بہادر شاہ ظفر۔ شاہد شیروانی) تھا۔ جس کے پاس اس کے ارکانِ دولت اور وزیر بھی تھے لیکن وہ خود ضعیف، غمزدہ اور ناتجربہ کار تھا۔ عمر کی کافی منزلیں طے کر کے بڑھاپے کی وادی میں قدم رکھ چکا تھا۔ اور سچ پوچھیے تو آمر و حاکم ہونے کے بجائے اپنی شریک حیات (ملکہ زینت محل۔ شاہد شیروانی) اور وزیر (حکیم احسن اللہ خاں۔ شاہد شیروانی) کا مامور ومحکوم تھا۔ اس کا یہ وزیر جو حقیقت میں نصاریٰ کا کار پرداز، اور ان کی محبت میں غالی تھا صحیح معنوں میں حاکم و والی اور نصاریٰ کے دشمنوں کا شدید ترین مخالف تھا۔ یہی اس آمر و حاکم کے اہل خاندان کا حال تھا۔ ان میں سے بعض مقرب بارگاہ اور راز دار (شہزادہ مرزا مغل وغیرہ، شاہد شیروانی) بھی تھے۔ یہ سب کے سب جو جی چاہتا تھا کرتے تھے۔ اور وہ سردار ایسا ضعیف الرائے ناتجربہ کار تھا کہ کچھ جانتا ہی نہ تھا۔ اس سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد ہوتی تھیں۔ کوئی کام اپنی رائے سے نہ کرسکتا تھا۔ نہ کسی کو خفیہ یا علی الاعلان کوئی حکم دے سکتا تھا۔ نہ کسی کو نفع وضرر پہنچانے کی طاقت رکھتا تھا۔

یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ بعض شہر و دیہہ سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت (مولوی ابوسعید وغیرہم مستفتی، نور جمال مجیب، توثیق کنندگان ۳۳ علما۔ شاہد شیروانی) علماء وزہاد اور ائمہ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر، جدال وقتال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ادھر اس ناتجربہ کار سردار نے اپنے بعض ناعاقبت اندیش، سفیہہ، خائن اور بزدل اولاد (مرزا مغل وخضر سلطان وغیرہما۔ شاہد شیروانی) کو امیر لشکر بنا دیا۔ یہ لوگ دیانتدار عقلمندوں سے متنفر تھے۔ انھیں نہ تو میدان کارزار ہی سے کبھی واسطہ پڑا تھا اور نہ کبھی شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا ہی

موقع ہوا تھا۔ انھوں نے بازاری لوگوں کو اپنا ہمنشین و جلیس بنالیا۔ اس طرح یہ نا آموزدہ کار، آرام طلبی، اسراف اور فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے۔

وہ تنگدست ہو چکے تھے پھر مالدار ہو گئے۔ جب مال دار ہو گئے تو عیش پرستیوں میں پڑ گئے۔ لوگوں سے لشکروں کے ساز و سامان کے بہانے سے کافی مقدار میں مال جمع کرتے تھے۔ اور اس میں سے ایک حبہ بھی کسی لشکری پر خرچ نہ کرتے تھے۔ جو کچھ وصول کرتے تھے خود کھا جاتے تھے۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ لیکن ان کو تو زنانِ فاحشہ و تباہ کار نے طلایہ کی قیادت، اور کنیزوں کی شب باشی نے لشکروں کے ساتھ رات کو چلنے سے روک دیا۔ اور آلاتِ عیش و طرب نے آرام طلبی میں ڈال کر مقدمہ الجیش سے بھی پیچھے کر دیا۔ ان کے دلوں میں نامردی اور ذلیل اندیشہ بیٹھ گیا۔ اسی نے ان کو وسطِ لشکر میں ثابت قدمی سے روکا۔ اور شومیِ قسمت نے میمنہ سے اور قمار و تونگری نے میسرہ سے باز رکھا۔ ان کے خوشامدی اور بازاری ہم صحبتوں نے ساقہ (پچھلا) سے بھی علیحدہ رکھا۔

ایسا ہی ہوا کرتا ہے جب کسی نا اہل کو کوئی بڑا کام سپرد کیا جاتا ہے۔ اور کمزور پر بھاری بوجھ لادا جاتا ہے۔ وہ رات سو کر اور دن بدمست ہو کر گذارتے۔ جب بیدار و ہوشیار ہوتے تو غافل و حیران پھرتے۔ نوبت بایں جا رسید کہ نصاریٰ کا لشکر ان پر آ کر ٹوٹ پڑا۔

ایک بلند پہاڑی (پہاڑی دھیرج۔ شاہد شیروانی) پر چڑھ کر شہر کا رخ کر دیا۔ شہر کا محاصرہ کر کے خندقیں کھود ڈالیں۔ پہاڑی پر توپیں اور منجنیقیں نصب کر کے شہر پناہ اور مکانات پر گولہ باری شروع کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بجلیاں اور تارے ٹوٹ ٹوٹ کر عمارتوں پر گر رہے ہیں۔

ہندوستانیوں کا برسرپیکار اور ''باغی'' لشکر مختلف ٹولیوں میں تقسیم تھا۔ بعض گروہ کا کوئی جنرل ہی نہ تھا۔ بعض کو جائے پناہ بھی میسر نہ تھی۔ بعض کی طاقت فقر و فاقہ نے سلب کر کے ہاتھ پاؤں توڑ کر بٹھا دیا تھا۔ کچھ تھوڑا سا مالِ غنیمت ہاتھ لگنے سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ کچھ ترساں و لرزاں قلب کے ساتھ بھاگ چھوٹے تھے۔ بعض طغیان و سرکشی سے بدکار عورتوں پر قبضہ جما بیٹھے۔ بعض نے میدان جہاد کے تنگ و سخت فوجی کپڑے پہن کو صفوفِ جنگ میں داخل ہونے کو بُرا جانا۔ صرف ایک گروہ نصاریٰ کا جواب دیتے ہوئے بہادری سے لڑتا رہا۔

نصاریٰ جب لڑتے لڑتے تھک گئے اور پست ہو گئے تو غربی ہندوؤں سے مدد و معاونت

کے طالب ہوئے۔ ہندوؤں نے کثیر لشکر اور ساز و سامانِ حرب سے تھوڑی سی مدت میں پے در پے مدد کی تب نصاریٰ نے سخت لڑائی ٹھان دی۔ اور اس پہاڑی پر بہت سا لشکر اور مددگار و معاون جمع کر لیے۔ ان کے لشکریوں میں گورے منھ کے گروہ بھی تھے۔ اور ذلیل ترین ہندو اجیر بھی۔ اور وہ بدبخت و بدکیش مسلمان بھی جو ایمان کے بعد نصاریٰ کی محبت میں مرتد ہو کر اپنے دین کو چند ٹکوں کے بالعوض بیچ چکے تھے۔

ہزاروں شہری بھی نصاریٰ کی محبت کا دم بھرنے لگے۔ اور تمام ہندو ان کے ساتھی ہو گئے۔ مسلمانوں میں دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ تو ان (غیر ملکیوں) کا جانی دشمن تھا۔ دوسرا گروہ ان کی محبت میں اس درجہ غلو رکھتا تھا کہ اس نے ہندوستانی لشکر کی بربادی، مجاہدین کی شوکت و وقار کی خواری اور ان کے قلع و قمع کرنے میں مکر و حیلہ سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ ان کے اندر افتراق و انشقاق پھیلانا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

پھر تو نصاریٰ شہر اور اس کے پھاٹکوں، دربانوں اور محافظوں پر حملے کرنے لگے۔ ادھر جماعت مجاہدین اور لشکریوں کے ایک بہادر گروہ نے ان کے حملوں کو روکنا اور ان کے مقاصد میں حائل ہونا اپنے لئے اہم ترین فرض قرار دیا۔ دن رات پیدل اور سوار دادِ شجاعت دینے لگے۔

چار (مئی ۱۸۵۷ء سے ستمبر ۱۸۵۷ء تک۔ شاہد شیروانی) مہینے تک متواتر جنگ ہوتی رہی۔ دشمن اس مدت میں کثیر لاؤ لشکر، اور ساز و سامان کے باوجود شہر میں داخل نہ سکا۔ جب بھی حملہ کرتے تھے روکے جاتے تھے۔ جس وقت اقدام کرتے تھے لوٹائے جاتے تھے۔ بہادر اور نگہبان غازی بڑے زور شور سے یلغار کو روک رہے تھے۔ مدافعت و مبارزت میں خوب خوب جوہر دکھا رہے تھے۔ مقابلے میں ثابت قدم تھے اور ہر پیش قدمی کرنے والے پر آگے بڑھ کر حملہ آور تھے۔ ان میں سے بہت سے جامِ شہادت پی کر سعادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔

"نیکوکاروں کے لئے بہشت، حوریں اور اس سے بڑھ چڑھ کر بھی نعمتیں ہیں۔"

اب مجاہدین کی ایک مختصر جماعت باقی رہ گئی جو بھوک پیاس برداشت کر کے رات گذارتی اور صبح ہوتے ہی دشمن کے مقابلہ پر ڈٹ کر نبرد آزما ہوتی۔ لشکریوں کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر یہی شہر پناہ کی حفاظت، اور شہری سرحدوں کی نگہداشت کرتی۔

بدقسمتی سے ایک شب کو پہاڑی کی محاذی کمین گاہ پر ایک عیش پرست، بزدل اور کسل مند

جماعت مقرر کردی گئی۔ وہ اپنے ہتھیار اتار کر آرام کی نیند سو گئی۔ دشمن نے موقع غنیمت سمجھ کر شبخون مارا۔ اور ہتھیاروں پر قبضہ کر کے اسے قیامت تک کے لئے ابدی نیند سلا دیا۔

جب نصاریٰ نے اس کمین گاہ پر قبضہ کر لیا تو بہت سی توپیں اور منجنیقیں نزدیک ترین شہر پناہ اور قریب ترین برج پر ان کے گرانے اور محاذی پھاٹک کھولنے کے لئے لگا دیں۔ اور دن رات گوپھنوں اور بندوقوں سے گولیوں کا مینھ برسانا شروع کر دیا۔ جس سے شہر پناہ کی دیوار اور برجوں میں شگاف پڑ گئے۔ پھاٹک گر پڑا۔ اور امیدوں کے رشتے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ حائل پردہ درمیان سے اٹھ گیا۔ کوئی لشکری اٹھنے بیٹھنے کی وہاں قدرت نہ رکھتا تھا۔ نہ دیوار پر چڑھ کر جھانک سکتا تھا۔ جو جھانکتا تھا گولی کا نشانہ بن کر خندق میں جا پڑتا تھا۔

اب نصاریٰ نے یہ چال چلی کہ ایک لشکر دوسرے دروازے کی طرف روانہ کیا۔ تاکہ دوسری طرف سے حملہ محسوس کیا جائے۔ یہ دیکھ کر مجاہدین، اور لشکریوں کا گروہ ادھر متوجہ ہو گیا۔ اور دشمن کا مکر نہ سمجھتے ہوئے وہاں مدافعت میں مشغول ہو گیا۔ یہ موقع پا کر نصاریٰ اور ان کا لشکر، اسی گرے ہوئے پھاٹک، ٹوٹی ہوئی دیوار اور منہدم برج سے داخلِ شہر ہو گئے۔ وہاں انھیں کوئی مزاحم و مدافع نہیں ملا۔

پس وہ تلاش کر کے ان لوگوں کے گھروں میں پہنچ گئے جو پہلے ہی سے ان کے معاون و مددگار بن چکے تھے۔ انھوں نے فوراً ان کی حفاظت کا گھروں میں انتظام کیا۔ اور جلد جلد پہلے سے تیار شدہ ضیافت سے نوازا۔ انھیں خوب پیٹ بھر کر گوشت اور دودھ کھلایا پلایا اور تمام ضرورت کی چیزیں مہیا کیں۔

مکانوں کے دروازے بند کر کے دیواروں میں روزن کر دیئے تاکہ جو ''باغی'' ادھر آ نکلے اس پر گولی چلا کر اپنی حفاظت کر سکیں۔ چنانچہ جو لشکری یا شہری ادھر آ نکلتا یہ بندوق چلا کر مار ڈالتے۔ اور مقابل کا ان پر کوئی قابو نہ چلتا تھا۔

وہ فرصت کے منتظر رہتے تھے کہ موقع پا کر اپنے دوستوں کے گھروں کی طرح دوسرے گھروں میں بھی پہونچ کر انھیں شب و روز کی آرام گاہ بنائیں لیکن وہ لعنتی جب بھی نکلتے پکڑ کر قتل کر دیئے جاتے۔ اس لئے جہاں انھیں مقابلہ کا اندیشہ ہوتا وہاں بہت کم نکلتے۔ اس کے باوجود انھیں پہاڑی سے مسلسل مدد پہنچ رہی تھی۔ اور ہر عیسائی دوست ہندوان کی مدد میں پیش پیش تھا۔

بڑی مصیبت یہ آپڑی تھی کہ شہر میں نہ کوئی جائے پناہ رہی تھی اور نہ حاکم ہی رہا تھا۔ کیوں کہ حاکم (بہادر شاہ ظفر) اپنے اہل وعیال کو لے کر شہر سے تین میل دور مقبرہ (مقبرۂ ہمایوں۔ شاہد شیروانی) میں جا چکا تھا۔ وہ دراصل اپنی بیگم اور خائن وزیر کا مطیع تھا۔ جس نے کذب و بہتان سے کام لے کر دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر بادشاہ کو پھسلایا تھا کہ نصاریٰ قابض ہونے کے بعد اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔ اور اسی کو بزرگی وسرداری بخش دیں گے۔ وہ فریب خوردہ ان شیطانی وعدوں اور ابلیسی آرزوؤں پر خوش تھا۔

بادشاہ کے ساتھ اس کے تمام امراو متعلقین بھی اپنے اہل وعیال کو لے کر گھروں میں مال و متاع چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان سب کے شہر چھوڑ کر چلے جانے سے شہریوں پر سراسیمگی اور رعب طاری ہو جانا قدرتی امر تھا۔ مرعوب ومتاثر لوگ بھی مکان چھوڑ بھاگے۔

جب شہر کے مکان مکینوں سے خالی ہو گئے تو نصاریٰ اور ان کا لشکر ان میں داخل ہو گیا۔ انھوں نے مال ومتاع لوٹا، باقیماندہ ضعیفوں، بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ بہادرانِ شہر میں سے ایک بھی ایسا نہ بچا تھا جو ان کا کسی اعتبار سے مقابلہ کر سکتا۔

''باغی'' لشکروں میں سے بعض تو نصاریٰ کے قبضہ سے پہلے ہی بھاگ گئے۔ بعض قبضہ کے بعد ثابت قدم نہ رہ سکے۔ بعض کئی بار شہر میں مصروف کارزار رہ کر بے دم ہو چکے تھے۔ اب بنیوں اور دوسرے ہندوؤں نے جو نصاریٰ کے دوست تھے اور بادشاہ کے ان کارپردازوں (مرزا الٰہی بخش وغیرہ۔ شاہد شیروانی) نے جو مجاہد گروہ کے دشمن تھے ایسی تدبیر سوچی جس سے شہریوں اور لشکریوں کو ہلاک کر سکیں۔ انھوں نے وہ سب غلہ جو بنیوں کے پاس تھا چھپا دیا اور دیہات و قصبات سے جو ان کے پاس اناج آتا رہتا تھا وہ روک دیا۔

یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ لشکری اور شہری بھوک، پیاس، سوزش اور بے چینی سے دن رات گذارنے لگے۔ بالآخر مجبور و پریشان ہو کر بھاگ چھوٹے۔ پھر تو نصاریٰ نے شہر کے پھاٹک، شہر پناہ، قلعہ، بازار اور مکانوں پر مکمل قبضہ جما لیا۔

اس وقت دہلی میں میرے اکثر اہل وعیال (مولوی شمس الحق اور ان کی والدہ وغیرہ۔ شاہد شیروانی) موجود تھے۔ اور مجھے بلایا بھی گیا تھا۔ ساتھ ہی فلاح وکامیابی، کشائش وشادمانی کی امید بھی تھی۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ تو پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا۔ میں نے دہلی کا رخ کر دیا وہاں پہنچ کر

اہل وعیال سے ملا۔ اپنی عقل وفہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا لیکن نہ انھوں نے میرا مشورہ قبول کیا اور نہ میری بات مانی۔

جب نصاریٰ کا شہر پر اچھی طرح تسلط ہو گیا اور کوئی لشکری وشہری باقی نہ رہا۔ غلہ اور پانی دشمنوں کے ظلم واستبداد کی وجہ سے ناپید ہو گیا تو پانچ شبانہ روز اسی حالت میں گذار کر اپنی عزیز ترین متاع کتابیں، مال واسباب چھوڑ کر (بار برداری کا انتظام نہ ہو سکنے کی وجہ سے) خدا پر بھروسہ کر کے اہل وعیال کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا۔

شہر اور اس کے مال ودولت پر سفید رولشکریوں کے ذریعہ قابض ہو کر نصاریٰ کی تمام تر توجہ، بادشاہ اور اس کے بیٹوں اور پوتوں کے پکڑنے کی طرف مبذول ہوئی۔

ان سب نے اپنا مستقر (مقبرہ) اب تک نہ چھوڑا تھا۔ تقدیر الٰہی نے وہیں برقرار رکھا تھا۔ انھیں اپنے جھوٹے اور مکار وزیر کی کذب بیانی پر اعتماد تھا۔ وہ اس مقبرہ میں بڑے خوش اور مگن تھے۔ مخدوم بنے ہوئے دن گذار رہے تھے۔

اس فریب خوردگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسرت کشیدہ، دل تپیدہ بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ پابہ زنجیر شہر کی طرف لے جایا گیا۔ راستے میں، بیٹوں اور پوتوں کو کسی سردار (مسٹر ہڈسن نے مرزا مغل اور خضر سلطان وغیرہما کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ شاہد شیروانی) نے بندوق کا نشانہ بنایا۔ دھڑ وہیں پھینک کر سروں کو خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے تحفۂ پیش کیا۔ پھر ان سروں کو بھی کچل کر پھینک دیا۔

بادشاہ کو، گورے منھ، سیاہ دل، گندمی بال اور کنجی آنکھ والوں کی حراست میں سوئی کے سوراخ سے بھی تنگ کوٹھری میں مقید کر دیا۔ پھر اس وسیع ملک سے نکال کر دور دراز جزیرہ (رنگون) میں پہنچا دیا۔

بادشاہ کے ساتھ اس کی بیگم (ملکہ زینت محل) کو بھی روانہ کیا گیا جو نصاریٰ کی اس وقت بھی مطیع ودوست تھی۔ جب کہ وہ حقیقت میں ملکہ تھی وہ اپنی آرزوؤں، (بیٹے کو جانشیں بنانے) میں ناکام رہی۔ اس کا جمع کردہ مال بھی چھین لیا گیا وہ زینت (زینت محل) بننے کے بعد بدصورت اور حفاظت کے بعد بدہیئت بنی۔ بادشاہ کی قوم میں سے جو بھی ملتا اس کی گردن ماردی جاتی۔ یا پھانسی دی جاتی جیسا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی عمل کیا گیا۔ ان کمزوروں میں سے وہی بچ سکا جو رات میں چھپ کر یا دن میں نظر بچا کر تیزی سے بھاگ گیا۔ اور ایسے خوش ب بہت کم تھے۔

پھر نصاریٰ نے شہر کے گرد و نواح کے رئیسوں اور سرداروں کو قتل کرنا، ان کی جائداد، عمارتیں، مویشی، مال و متاع، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اور ہتھیار وغیرہ کو لوٹنا شروع کیا۔ اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کے اہل وعیال کو بھی قتل کر ڈالا۔ حالاں کہ سب رعایا بن چکے تھے۔ اور ڈر یا لالچ سے فرماں بردار بن ہی جاتے۔ انھوں نے تمام راستوں پر چوکیاں بٹھادیں تاکہ بھاگنے والوں کو پکڑ پکڑ کر لایا جائے۔ ہزاروں بھاگنے والوں میں تھوڑے ہی بچ پائے باقی سب پکڑے گئے۔

ان لوگوں کے پاس جو کچھ چاندی سونا نکلتا پہلے تو وہ چھین لیتے۔ پھر چادر، تہبند، قمیص، پاجامہ جو کچھ ہاتھ لگتا نہ چھوڑتے۔ اس کے بعد افسروں کے پاس پہنچا دیتے۔ وہ ان کے لئے قتل یا پھانسی کی سزا کا فیصلہ کرتے۔ جوان، بوڑھا، شریف اور رذیل سب کے ساتھ یہی سلوک ہوتا۔ اس طرح پھانسی پانے والوں اور قتل ہونے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ ظالموں کے ظلم کا شکار اکثر و بیشتر مسلمان تھے۔

ہندوؤں میں سے صرف وہ مارے گئے جن کے متعلق دشمن و معاند ہونے کا یقین تھا۔ اور مسلمانوں میں سے فقط وہ بچ سکے جو کسی نہ کسی طرح وہاں سے ہجرت کر گئے تھے۔ یا وہ جو نصاریٰ کے ناصر اور اپنے دین و مذہب میں قاصر تھے۔ یا وہ جو ان کے جاسوس اور اللہ کی رحمت سے مایوس تھے۔ انھیں میں سے بادشاہ کا وہ عامل (حکیم احسن اللہ خاں۔ شیروانی) بھی تھا جس نے نصاریٰ کو مسلط کر کے حاکم بنایا تھا۔ لیکن اسے امیدوں کی محرومی اور ناکامی کی حسرت کا غم اٹھانا پڑا۔ اس کا حال متغیر ہوگیا۔ زمانے میں ذلیل و خوار ہو کر جیا۔ دنیا اور آخرت دونوں جگہ نقصان میں رہا۔ اور یہی کھلا ہوا نقصان ہے۔

ادھر نصاریٰ نے ماتحت ہندو رؤسا کے پاس پیغام بھیجا کہ جو شخص بھی تمہارے علاقہ میں سے گذرے اسے پکڑ لیا جائے۔ ان بد اطواروں نے کافی تعداد میں مسافروں اور مہاجروں کو پکڑ کر نصرانی سرداروں کے پاس پہنچا دیا۔ ان ظالموں نے سب کو مار ڈالا۔ نہ کوئی عالی خاندان فرد بچ سکا نہ کسی ادنیٰ انسان کو چھٹکارا نصیب ہوا۔ پھر اطراف و اکنافِ ملک میں لشکر بھیجے جنھوں نے قتل و غارتگری کی انتہا کر دی۔

اس ابتلاء عظیم میں پردہ نشیں خواتین پیدل نکل کھڑی ہوئیں۔ ان میں بوڑھی اور عمر رسیدہ بھی تھیں۔ جو تھک کر عاجز ہو گئیں۔ بہت سی خوف کی وجہ سے جان دے بیٹھیں۔ اور بچا سیوں

عفت وعصمت کی بنا پر ڈوب کر مر گئیں۔ اکثر پکڑ کر قیدی بنالی گئیں۔ اور طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئیں۔ کچھ کو بعض رذیلوں نے لونڈیاں بنالیا۔ اور بعض چند ٹکوں کے بالعوض بیچ ڈالی گئیں۔ بہت سی بھوک، پیاس کی تاب نہ لاکر مر گئیں۔ بہت سی ایسی غائب ہوئیں کہ پھر نہ تو لوٹ کر ہی آئیں نہ ان کا کچھ پتہ ہی چل سکا۔

ہزاروں عورتیں، اپنے سر پرستوں، شوہروں، باپوں، بیٹوں، اور بھائیوں سے جدا کر دی گئیں۔ وہ ایسی مصیبت کا زمانہ تھا جو قیامت کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کہ اس دن انسان اپنے بھائی، ماں باپ، بیوی، اولاد، اور اہل خاندان سے بھاگتا نظر آئے گا۔

بہت سی صبح کی سہاگن عورتیں شام کو بیوہ بن گئیں۔ اور شب کو آغوشِ پدر میں سونے والے بچے صبح کو یتیم ہو کر اٹھے۔ کتنی ہی عورتیں اپنی اولاد وغیرہ کے غم میں گریہ وزاری کرتی تھیں۔ اور کتنے مردوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری تھا۔ شہر چٹیل میدان اور بے آب وگیاہ جنگل بن گیا تھا۔ اور شہری تباہ وبرباد و منتشر ہو گئے تھے۔

اس کے بعد نصاریٰ کی توجہ مشرقی شہروں اور دیہات کی طرف مبذول ہوئی۔ وہاں بھی بڑا فساد مچایا۔ قتل وغارتگری اور پھانسی کا بازار گرم کر دیا۔ بے شمار مرد اور پردہ نشیں مستورات موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اور سینکڑوں، ہزاروں رعایا کے آدمی مار ڈالے گئے۔

میرا کیا پوچھنا، میں اپنے وطنِ مالوف (خیر آباد، اودھ) کی طرف چلا جا رہا تھا۔ راستہ خوفناک، اور رہ گذار اندوہناک تھا۔ میرے اور وطن کے درمیان کئی خوف وخطرہ سے بھری ہوئی منزلیں تھیں۔ نصاریٰ اور ان کا لشکر، دن رات تلاش وتجسس میں سرگرداں رہتا۔ جاٹوں کو مسافروں کے مار ڈالنے، لوٹنے، ڈاکہ ڈالنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی تھی۔

انھوں نے سارے ناکے بند کر رکھے تھے۔ اور کسی گھاٹ پر کوئی کشتی یا ناؤ تک نہ چھوڑی تھی۔ کشتیوں کو پھاڑ ڈالتے بلکہ خراب کر کے غرق کر دیتے یا جلا ڈالتے۔

ملاحوں کو روک دیا تھا تا کہ کوئی سیاح یا مسافر کسی وقت بھی ادھر سے نہ گذر سکے۔

خدائے مالک الملک نے مجھے اور میرے متعلقین کو ہر مصیبت وہلاکت سے محفوظ رکھ کر، پل اور کشتی کی مدد کے بغیر، دریاؤں اور نہروں کو عبور کرا کے نجات دی۔ اور ہم سب کو آفاتِ مسافات، مہالکِ مسالک، حوادثِ راہ، اور مصائبِ گذرگاہ سے مصؤن ومامون رکھا اور اپنی پوری حفاظت،

کامل حمایت، مکمل نعمت اور بے شمار رحمت کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے جوار و دیار اور احباب و رشتہ دار تک پہنچایا۔ ہم خدا کی اس بے پناہ عنایت اور تمام آفات سے حفاظت پر اس کا شکر بجالائے۔

نصاریٰ کے ''باغی'' گروہوں اور ہمارے نواح کے متعدد لشکروں نے اپنے سابق معزول والی (واجد علی شاہ اختر۔ شاہد شیروانی) کی ایک بیگم (حضرت محل۔ شاہد شیروانی) اور اس کے ایک ناتجربہ کار اور ناسمجھ لڑکے (برجیس قدر۔ شاہد شیروانی) کو امیر و حاکم بنا ڈالا۔ نصاریٰ نے اس والی سے اس کا ملک چھین لیا تھا۔ وہ بڑا واہی ولاہی تھا۔ عیش و طرب میں منہمک، انتظامِ ملکی سے غافل، عقل و خرد سے بیگانہ اور نقضِ عہد و میثاق میں یگانہ تھا۔ نصاریٰ کی عملداری ختم ہونے پر وہ ملکہ، مالکہ بن گئی۔ اس کا لڑکا چھوٹا، ناتجربہ کار، نازپروردہ، ہمسنوں کے ساتھ کھیلنے والا اور دشمن سے لاپرواہ تھا۔ تدبیرِ امورِ مملکت، اِجرائے احکام اور قیادتِ فوج کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس کے اَعیانِ سلطنت وارکانِ دولت (ممو خاں وغیرہ۔ شاہد شیروانی) سب کے سب نااہل، سست، بزدل، احمق، خائن اور غیر دیانتدار تھے۔ اکثر ذلیل اور بعض بندگانِ زر تھے۔ ان میں سفیہہ، عیش پرست، نادان، بلند آواز، سُست، منافق، چرب زبان، ذلیل، غلام زادہ، حیران و پریشان، ظالم و جابر، حیلہ ساز و متکبر، خائن و مکار، بندۂ زر و غیبت خور بھی قسم کے لوگ تھے۔

بعض ایسے بھگوڑے مدبر تھے کہ ان کی تدبیر، تباہی و بربادی و اِدبار کی طرف لے جاتی تھی۔ اور صاحب نظر افراد کو عبرت کے عجیب عجیب مناظر دکھاتی تھی۔ ان میں سے اکثر نصاریٰ کے معاون و مددگار اور محبّ و وفا شعار تھے۔ اور یہ سب کے سب دشمن کی ہلاکت خیز تدبیروں سے ناواقف اور ان کی مصلحت اندیشی سے بے خبر تھے۔

نصاریٰ اپنے بچوں اور عورتوں کے ساتھ شہر (لکھنؤ) میں محصور مگر مخالف گروہ کی ناقص تدبیروں کی وجہ سے اپنے مکانوں (بیلی گارد) میں محفوظ تھے۔ نصاریٰ نے خندقیں کھود کر اور حصار بنا کر ان مکانوں کو قلعہ کی شکل دے لی تھی۔ مقابل لشکر، ان پر حملہ آور ہو کر پسپا ہو جاتا تھا۔ جو کچھ کہتا وہ نہ کر پاتا تھا۔ اسی حالت میں محصورین کی امداد کے لئے سفید رُو گروہ آگیا۔ شہر میں داخل ہونے لگا۔ تو بہادر غازیوں نے ڈٹ کر مقاتلہ کیا۔ بہت سے گورے مارے گئے۔ باقی ماندہ دل شکستہ اور حسرت زدہ ہو کر محصورین تک پہنچ گئے۔ پھر تازہ دم ہو کر یہ مکانوں سے نکلے تو بزدلی اور کوتاہی کی وجہ سے کوئی مقابلہ پر نہ آیا۔ نصاریٰ نے شہر سے دو میل دور باغ پر قبضہ جمالیا۔ اور قوت

وبہادی سے اسی کو اپنا گڑھ بنالیا۔ وہاں مدد پر مدد اور سامان پر سامان جمع کرلیا۔

وہ لشکری جو شہر میں پہلے سے موجود تھے اور وہ جو دہلی (جنرل بخت خاں وشہزادہ فیروز شاہ وغیرہما۔ شاہد شیروانی) سے بھاگ کر بیگم کی پناہ میں آگئے تھے۔ جن کو ملکہ نے قدر ومنزلت کے ساتھ جود وبخشش سے نوازا تھا۔ اور تنخواہ دار سپاہیوں کا وہ جم غفیر، جو حرب وضرب سے نابلد، اسلحہ بندی سے ناواقف، اور مصلحت ومعرکہ سے ناآشنا تھا۔ یہ سب اس باغ پر خندقیں کھود کر اور کمین گاہ بنا کر جاڈٹے۔

دونوں فریقوں میں ایک مدت تک مقابلہ ومقاتلہ اور نیزہ بازی وتیر اندازی ہوتی رہی۔ تنگ آکر نصاریٰ نے پہاڑوں کے والی سے مدد مانگی۔ اس نے ان کی آرزو کے مطابق تیس ہزار سے زیادہ پہاڑی لشکر بھیج کر مدد کی۔

اب تو نصاریٰ، ان کی گوری فوجوں، کرایہ کے سپاہیوں، اور لالچی معاونوں نے ایک ساتھ حملہ کردیا۔ یہ حملے بڑے سخت، متواتر اور مسلسل تھے۔ جنھوں نے مقاتلین کو ان کی جگہ سے ہلادیا۔ اور ان کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ وہ کمین گاہوں سے ایسی بری طرح بھاگے کہ شہر کی سرحدوں پر بھی نہ ٹھیر سکے۔

ملکہ اور اس کے لڑکے کو تنہا محل میں چھوڑ بھاگے۔ ان دونوں سے وقت پر بہت سے ارکان دولت واَعیانِ سلطنت نے دغا کی۔ اور وہ دیہاتی جوان کے علاقہ سے ان کی مدد واعانت، عزت وآبرو، مال ودولت کی صیانت وحفاظت کے لئے آئے تھے عہد شکنی کر کے اور کفر کو ایمان سے بدل کر منافق بن گئے۔ نصاریٰ کی موافقت ورفاقت کرنے لگے۔ نصاریٰ مع معاونین شہر میں داخل ہوگئے۔ شہر کے رہنے والے گھروں کو خالی کر کے نکل گئے۔

نصاریٰ اور ان کی گوری فوج اور مددگاروں نے اس شاہی محل کا جس میں ملکہ تھی محاصرہ کرلیا۔ بیگم اپنے ولی عہد اور دو سہیلیوں کو لے کر محصور محل کی پشت سے نکل کر دوسرے محلہ میں تیزی سے پیدل پہونچ گئی۔ تین دن شہر میں رہ کر بھاگے ہوئے لشکر کو واپس کرنے اور اس سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ لشکر ایسا دہشت زدہ ہو چکا تھا کہ کسی صورت سے اس نازک موقع پر دستگیری کو تیار نہ ہوا۔ نہ ان میں سے کوئی متنفس لوٹا اور نہ شہر بھر میں کہیں اجائے پناہ ہی رہی۔

آخر کار بیگم اپنے اَعوان وانصار سے مایوس ہو کر ولی عہد اور چند ساتھیوں کو ساتھ لے کر،

چٹیل میدان اور بے آب و گیاہ جنگل کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ اب اس کے گرد، کمزور دل سواروں کی کچھ جماعتیں، پیدل مردوں کا انبوہ کثیر، شہریوں اور عزت دار عورتوں کی کافی تعداد آ کر جمع ہوگئی۔ وہ شہری ننگے بدن اور ننگے پاؤں تھے حالاں کہ سرداروں میں سے تھے اور عورتیں ننگے پاؤں اور بے پردہ تھیں حالاں کہ گرامی قدر، پردہ نشیں اور محل سراؤں کی رہنے والی تھیں۔ وہ سرسبز و شاداب خطوں سے چٹیل میدان کی طرف پھینک دی گئیں۔ وہ پیوندوں کے کپڑے پہن کر ستر پوشی کرتی تھیں اور برقعے نہ ہونے سے اس پر اکتفا کرتیں۔ ایک میدان سے دوسرے میدان میں پہنچتیں، بے پردگی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا۔ وہ عیش و عشرت میں زندگی بسر کرتی تھیں پھر دور دراز جنگل اور پر خطر میدان میں ڈال دی گئیں۔ ان لوگوں کو محلات، پائیگاہیں اور ریاستیں چھوڑنی پڑیں، حالاں کہ وہ ان سے ذرا بھی ہٹنا نہ چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ حال متغیر، وبال نازل اور ہلاکت عام ہوگئی۔

یہ ایسی مہلک مصیبت نازل ہوئی جس نے شہروں کو میدان، آزادوں کو غلام، مالداروں کو فقیر و مسکین اور شریفوں کو خوار و ذلیل بنا دیا۔ وہ اپنے اہل و عیال میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ خوش حال، اور فارغ البال تھے کہ مجبور ہو کر نکلنا پڑا۔ فقیری و تنگدستی نے ہمسنوں کی مجالست اور اضطراب و اضطرار نے برابر والوں کی رفاقت سے دور کر دیا۔ رونے والے آہ و زاری، بیمار فریاد و شیون کرتے، آرزومند چلاتے، اور حسرت کشیدہ انا للہ پڑھتے۔ بچے اپنی ماؤں کے سینوں سے قبل از وقت جدا کر دیئے گئے تھے۔ بوڑھے اور جوان حاجتوں کے پورا کرنے سے ناامید تھے۔ نہ ان کا کوئی ٹھکانہ تھا نہ بیماری کی دوا تھی۔ ان کے دل خالی تھے۔ ان میں نہ کوئی خواہش تھی نہ انھیں کوئی بات بھاتی تھی۔ زندگی اور موت ان کے لئے دونوں برابر تھے۔

وہ مسرت و شادمانی، تخت شاہی، دیباج و حریر، میوے، خوش طبعی، عیش و عشرت، نظافت و نزاہت، نزاکت و نعمت، نغمہ و سرود، مال و دولت، خیر سگالی و مروّت میں پلے تھے۔ آج ان کی راہ میں کانٹے ہیں۔ سامان و زادِ راہ کا پتہ نہیں۔ کپڑے بوسیدہ ہیں اور عیش و راحت میں کوئی حصہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے انہیں معاف کرے اور ظالموں کو سخت گرفت میں لے۔

پھر والیہ یعنی حضرت عالیہ اس لشکر کو جو بھاگ کر اس کی پناہ میں آ گیا تھا اور دوسرے ساتھیوں کو لے کر ایسے دریاؤں اور نہروں سے گذری جن سے بغیر کشتی کے عبور مشکل و دشوار

تھا۔ وہ شمالی ملک میں دریا کے کنارے ایک گاؤں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اقامت گزیں ہوگئی۔ اور دریا کے گھاٹوں پر سوار، پیادے بٹھادیئے کہ تمام کشتیوں پر قبضہ کرلیں۔ اور دشمنوں کو دریا عبور نہ کرنے دیں۔

اس نے انتظام رعایا اور حصول خراج کے لئے شہروں اور قصبات و دیہات میں عامل بھیج دیئے۔ لشکروں کو آراستہ کرکے اپنے اس دارالسلطنت کے قریبی مورچوں پر جس پر اب نصاریٰ کا قبضہ ہوچکا تھا بھیج دیا تاکہ اگر دشمن ادھر کا قصد کرے تو اس سے ڈٹ کر مقابلہ ومقاتلہ، مزاحمت و مجادلہ کیا جائے۔ لیکن یہ تمام امور مہمہ اور ان کا اہتمام وانصرام ایسے ذلیل، غافل اور متحیر عامل (نواب احمد علی عرف مموخاں۔ شاہد شیروانی) کو سونپا گیا تھا جو کسی طرح اس کا اہل نہ تھا۔ وہ صحیح مشورے سے گریزاں اور جہل سے ہم کنار تھا۔ آسان بات کو سخت اور دشوار کو آسان سمجھتا۔ وہ ذلیل، احمق اور بزدل تھا۔ اس نے مکالمت و مشاورت، مجالست اور منادمت کے لئے احمق، جاہل، اور ذلیل طبقہ کو چن رکھا تھا۔ وہ نخوت وغرور کی بنا پر شریف سرداروں اور عقلمند رہنماؤں سے بچتا اور اپنے ہی اہل خاندان اور اعزہ میں سے جاہلوں اور احمقوں کو مصاحب وحاکم بناتا۔

چنانچہ اس ناتجربہ کار نے ان لشکروں پر کمین، ذلیل، بزدل اور رذیل لوگوں کو سردار بنادیا۔ وہ بڑے ہی لالچی تھے۔ جو کچھ لشکریوں کو خوراک وغیرہ دی جاتی کھا جاتے۔ وہ بددیانت تھے۔ اپنی کینہ پروری کی وجہ سے ان کے غلّہ اور جنس میں خیانت کرتے اور گراں فروشی کے مرتکب ہوتے۔ ہر آواز کو دشمن کی آواز سمجھتے۔ ہمیشہ اضطراب کے ساتھ خوف کی وجہ سے لرزتے رہتے۔ کسی وقت بھی ان کو راحت وسکون میسر نہ تھا۔ بزدلی سے ہر آواز کو موت کا پیش خیمہ اور ہر صدا کو موت کی پکار سمجھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کمینے دشمنوں کے سامنے محبت وحاجت کے ساتھ پیش ہورہے ہیں۔

نصاریٰ دارالسلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد وہیں ڈٹے رہے۔ اطراف وجوانب کی طرف نہ نکلے۔ انھوں نے گرد ونواح کے کافروں، دیہاتیوں اور کاشتکاروں کی تالیفِ قلب شروع کردی۔ ان کی خطاؤں کو درگزر، ان کے خراج میں تخفیف اور تاوانوں میں کمی کی۔

اس مہربانی پر وہ مطیع وفرماں بردار ومعاون ومددگار بن گئے۔ ادھر سے مطمئن ہوکر اطرافِ ملک میں شہروں دیہات پر قبضہ کرنے کے لئے نصاریٰ نکل کھڑے ہوئے۔ جب نصاریٰ

اس مرصد (نواب گنج ضلع بارہ بنکی۔ شاہد شیروانی) کی طرف متوجہ ہوئے جو دارالسلطنت سے جانب شمال آٹھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اور جس میں سوار، پیادے اور وہ رذیل و ذلیل قائد عظیم بھی تھا۔ تو وہ کمین قائدان کی آمد کی خبر سن کر ہی اپنے ذلیل سرداروں کے ساتھ بھاگ گیا۔ بہادر ہندوؤں کی تھوڑی سی تعداد اپنے گاؤں کے بہادر مکھیا کے ساتھ مقابلہ پر ڈٹ گئی۔ یہ سو سے زیادہ نہ تھے۔ دشمنوں کو فنا کے گھاٹ اتار کر خود بھی کٹ گئے۔ وہ فرار کی عار برداشت نہیں کر سکتے تھے اور بھگوڑے قائد کی طرف سے کافی لشکر اور ساز و سامان کے ہوتے ہوئے بھی انھیں کوئی مدد نہیں پہنچ سکی تھی۔

نصاریٰ نے جب اس گاؤں کو جس میں وہ نامرد خائن عامل نگہداشت کے لئے موجود تھا، خالی اور ویران پایا تو اس پر قبضہ جما کر اپنا مضبوط و محفوظ قلعہ بنالیا۔ وہیں فوج جمع کر لی اور مدت تک وہیں مقیم رہے۔ وہ ایک میل بھی نکل کر نہ گئے۔ وہ سرداران لشکر کی امیدوں کی تکمیل، اور ان خائنوں کے ایفائے عہود کے منتظر تھے۔ اسی لئے اپنے ایفائے وعدہ میں بھی تاخیر کر رہے تھے۔

ادھر سے فارغ ہو کر انھوں نے اس مغربی گوشے کا رخ کیا جہاں کے تمام باشندے ان کے مطیع ہو چکے تھے۔ اور دشمنوں پر ان کے معاون تھے۔ وہاں بھی ملکہ کی طرف سے ناعاقبت اندیش، غیر مدبر، ناتجربہ کار، اور ذلیل عامل تھا۔ وہ بھی پیٹھ پھیر کر مقابلہ کیے بغیر بری طرح بھاگا۔ سرنگ میں ہو کر اپنا راستہ بنایا۔ اس کے پاس سوار اور پیادے بھی کم تھے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ کفار اور دیہاتیوں نے معاہدہ و قسم کے باوجود وقت پر دغا کی۔ غدر و مکر کی انتہا کر دی۔

ناز و نعمت اور پُر عیش و مسرت زندگی کا کفران کیا۔ معاہدوں سے انکار کر کے کفر میں اضافہ اور ارتداد میں زیادتی کر لی۔ اس موقع پر متسلط نصاریٰ سے قتال کے لئے دوسری طرف کا ایک عامل (شاہ احمد اللہ مدراسی۔ شاہد شیروانی) اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے خیرات و مبرّات اور سعادات و حسنات کا کافی ذخیرہ اپنے اندر جمع کر لیا تھا۔ وہ بڑا ہی پاک طینت، صاف باطن، متقی، پرہیزگار، بہادر اور رسولِ ملاحم اور نبیِ مراحم احمد ﷺ کا ہم نام تھا۔ اس نے نصاریٰ کے لشکر پر حملہ کر کے پہلے ہی حملہ میں شکست دے دی۔

اپنی ساری کوششیں ختم کر کے وہ بھاگے اور قصبہ کے ایک ہندو کے مضبوط و محفوظ مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اور عظمائے نصاریٰ کے پاس شہر میں پیغام بھیج کر مدد مانگی۔ انھوں نے

ایک لشکر اور منافقین و دہاقین کا جمِ غفیر جنھوں نے عہد شکنی کی تھی، ان محصورین کی مدد کو بھیج دیا۔

ادھر اس نیک سرشت بہادر عامل سے ایک دیہاتی کافر زمیندار (بلدیو سنگھ راجہ پوائیں ضلع شاہجہاں پور۔ شاہد شیروانی) نے بڑا داؤ کھیلا۔ اس نے قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جب دونوں جماعتیں مقابلہ پر آجائیں گی تو چار ہزار بہادروں کا گروہ لے کر مدد کو پہنچوں گا۔ جب مقابلہ کی نوبت آئی تو اس زمین دار کی قسموں پر بھروسہ کر کے اس دیانتدار عامل نے اپنے تھوڑے سے بہادروں کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سامنے سے بندوقوں اور توپوں سے چہروں اور سینوں پر نصاریٰ نے گولیاں برسائیں۔ اور پیچھے سے اس غدّار مکّار زمین دار کی جماعت نے پشت و سُرین کو نشانہ بنانا شروع کیا۔

وہ دراصل نصاریٰ کے انصار و اَعوان اور شیاطین کے اَتباع و اِخوان تھے۔ وہ خدا پرست عامل معرکہ میں گر کر شہید ہوا۔ اور اس کی ساری جماعت نے بھی اسی کے نقش قدم پر چل کر جامِ شہادت نوش کیا۔ ان سب ابرار و اخیار کی شہادت کے بعد بزدل لوگ ایسے بھاگے کہ نامردی اور اضطرار سے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ نصاریٰ نے تعاقب کر کے ان سب کو پکڑ کر قتل کر ڈالا۔ تھوڑے سے وہ بچ رہے جنھوں نے بھاگنے میں پوری تیزی اور عجلت سے کام لیا۔

اس نواح کے سارے باشندے، دہقانی، کاشتکار، مکھیا اور مقدم وغیرہم سب مطیع و فرماں بردار بن گئے۔ اَلبتہ دو بہادر، غیرت مند اور صف شکن جوانمردوں نے خوب جم کر مقابلہ کیا۔ اپنی بے پناہ شجاعت و بسالت سے قلتِ اسباب و جماعت کے باوجود دشمن کے ہزاروں سوار، پیادے ٹھکانے لگا دیئے۔ آخر کار مجبور ہو کر اپنی بہادری سے جان بچا کر نکل گئے اور دشمن ان کا تعاقب نہ کر سکا۔ اب وہ نواح بھی صاف ہو گیا۔ ان دونوں سرداروں کی شکست کے بعد مخالفوں کے دل میں دشمن کا رعب قائم ہو گیا۔ یہ واقعہ رنج دِہ واقعات میں سے سب سے اہم اور آخری واقعہ اور اس جنگ کا خاتمہ تھا۔

نصاریٰ یہاں غالب ہونے کے بعد دوسرے اطراف میں پھیلنا شروع ہوئے۔ وہ جب کسی طرف کا قصد کرتے تو وہاں کے رہنے والے غم و فکر میں مبتلا ہو جاتے۔ اور لڑے بھڑے بغیر شکست مان لیتے۔ ان تمام فتح مندیوں کے بعد بھی ملکۂ نصاریٰ (وکٹوریہ) مکر سے باز نہ رہی۔ اس مکر کی وجہ سے انھیں بڑی قوت و طاقت حاصل ہو گئی۔ اس نے تمام دیہات، شہروں اور قصبوں

میں مطبوعہ حکم نامے جاری کیے۔ جن میں عام معافی کا اعلان کیا۔ کہ تمام ''باغی'' لشکراور سرکش و نافرمان رعایا کو ان لوگوں کو چھوڑ کر معاف کیا جاتا ہے جنھوں نے عورتوں، بچوں اور ان نصاریٰ کو جنھوں نے مجبور ہو کر پناہ لی تھی، ظلم وعداوت سے قتل کر ڈالا۔ یا وہ جنھوں نے مجبور ہو کر پناہ لی تھی، ظلم وعداوت سے قتل کر ڈالا۔ یا وہ جنھوں نے سلطنت وریاست قائم کی۔ یا وہ جنھوں نے سرکشی و عدوان پر لوگوں کو ابھارا۔ ادھر وہ ''باغی'' لشکراور دوسرے بیگم کے ساتھی، روزی کے نہ ہونے اور تنخواہ وضروریاتِ زندگی میسر نہ آنے سے پریشان ہو چکے تھے۔

نصاریٰ کے مسلّط ومنتشر ہو جانے کی وجہ سے بیگم کے پاس خراج اور محاصل کا آنا بند ہو گیا تھا۔ زمین کشادگی کے باوجود ان پر تنگ ہو چکی تھی۔ وہ بڑی سخت مصیبت وتنگی میں پڑ گئے تھے۔ وہ سب تنگ دست اور عیش وراحت سے دور تھے۔ ان کے دل اہل وعیال کی جدائی سے پارہ پارہ تھے۔

ایسے حالات میں مجبور ومضطر ہو کر بہت سے لشکری وغیرہ نصاریٰ کے اطاعت گذار بن گئے۔ ان کے پاس ہتھیار، گھوڑے جو کچھ تھا چھین لیا گیا۔ اور پروانۂ امان دے دیا گیا۔ اب وہ اہل وطن کی طرف خائب و خاسر ہو کر لوٹے۔ پھر نصاریٰ سارے ملک پر بلا مزاحمت قابض ہو گئے۔ میدان کارزار اور لڑائیوں سے نجات پا گئے۔ بیگم اس تباہی وبربادی کے بعد بچے کچھے تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑوں (سرحدِ نیپال۔ شاہد شیروانی) کی چوٹیوں پر چلی گئی۔

میں مسافرت وغربت، اضطراب ومصیبت کی زندگی گذار رہا تھا۔ اور میرا اشتیاق ورغبت اپنے گھر، اہل وعیال، پڑوسی اور حباب تک پہنچنے کے لئے بڑھ رہا تھا کہ امن وامان کا وہی پروانہ جسے قسموں سے مؤکد کیا گیا تھا، نظر پڑا۔ اس پر بھروسہ کرکے اپنے اہل و وطن میں پہنچ گیا۔ مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر بھروسہ اور بے دین کے قسم ویمین پر اعتماد کسی حالت میں درست نہیں۔ خصوصاً جب کہ وہ بے دین جزا وسزائے آخرت کا قائل بھی نہ ہو۔

تھوڑے دن کے بعد ایک حاکم نصرانی نے مجھے مکان سے بلا کر قید کر دیا۔ اور رنج وغم میں مبتلا و مقید کر کے دارالسلطنت (لکھنؤ) جو دراصل اب خانۂ ہلاکت تھا بھیج دیا۔ میرا معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کر دیا جو مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ جانتا تھا اور میری چغلی ایسے دو مرتد، جھگڑالو، تندخو افراد نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے۔ جس کا حکم یہ تھا کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی مؤدت ومحبت پر مصر تھے۔ انھوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔

اس ظالم حاکم نے میری جلاوطنی اور عمر قید کا فیصلہ صادر کر دیا۔ اور میری کتابیں، جائداد، مال ومتاع اور اہل وعیال کے رہنے کا مکان، غرض ہر چیز پر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔ اس شرمناک رویّہ کا تنہا میں ہی شکار نہ بنا تھا۔ بلکہ بہت سی مخلوق سے اس سے بڑھ چڑھ کرنا روا سلوک روا رکھا گیا۔

انھوں نے عہد و پیمان توڑ کر ہزاروں مخلوقِ خدا کو پھانسی، قتل، جلاوطنی، قید اور حبس میں بلا تاخیر مبتلا کر دیا۔ وعدہ خلافی کر کے بیشمار نفسوں اور لاتعداد نفیس چیزوں کو تباہ کر ڈالا۔

اس طرح خونِ ناحق شمار سے آگے بڑھ گیا۔ سینکڑوں اور ہزاروں سے گنتی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح شریف وغیر شریف قیدیوں کی تعداد حد سے متجاوز ہے۔ خصوصاً دہلی اور ہمارے دیار (اودھ) کے مابین وسیع علاقے میں جہاں شریف وعظیم خاندانوں کے شہر کے شہر، گاؤں کے گاؤں اور قصبے کے قصبے آباد ہیں۔

ان شرفا وعظماء کے پاس ایک رئیس نے جو اسلام وایمان کا مدعی بھی تھا۔ دارالریاست میں طلبی کے ساتھ امن وامان کا پیغام بھیجا۔ وہاں پہنچنے پر اپنے وعدے سے پھر کر نصاریٰ کی خوشنودی کی خاطر غدّاری کر کے ان سب کو گرفتار کرلیا۔ بدعہدی کہ سارے مذاہب میں مذموم وممنوع ہے اس کا بھی لحاظ نہ کیا۔ یہ بدبخت نصاریٰ کی رضا جوئی میں خدائے عزیز ومنتقم کے غضب سے بھی نہ ڈرا۔ نصاریٰ نے ان سب کو ہتھکڑی اور بیڑی پہنا کر محبوس کر دیا۔ اکثر شرفا کو قتل اور باقی کو قید، جلاوطنی، اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا۔ اس طرح وہ بدنصیب رئیس بھی نصاریٰ کے ساتھ اللہ کی مخلوق کو سخت عذاب میں مبتلا کرنے کی وجہ سے اجر وانعام کا مستحق بن گیا۔

یہ المناک کہانی یوں ختم ہوئی۔ اب میرا ماجرا سنیے:

مکر وتلبیس سے نصاریٰ نے جب مجھے قید کرلیا تو ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے، اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کیا۔ مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہونچایا۔ میرا جوتا اور لباس تک اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیے۔ نرم وبہتر بستر چھین کر، خراب، سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کر دیا۔ گویا اس پر کانٹے بچھا دیئے گئے تھے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئی تھیں۔ میرے پاس لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن تک نہ چھوڑا۔ بجل سے ماش کی دال کھلائی اور گرم پانی پلایا۔ محبانِ مخلص کے آبِ محبت کے بجائے گرم پانی اور ناتوانی وکبرسنی کے باوجود ذلت ورسوائی سے ہر وقت سامنا رہا۔

پھر ترش رو دشمن کے ظلم نے مجھے دریائے شور (جزیرۂ انڈمان) کے کنارے ایک بلند و مضبوط، ناموافق آب وہوا والے پہاڑ پر پہنچادیا۔ جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا تھا۔اس میں دشوار گذار گھاٹیاں اور راہیں تھیں جنھیں دریائے شور کی موجیں ڈھانپ لیتی تھیں۔اس کی نسیم صبح بھی گرم وتیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس کی نعمت زہر ہلاہل سے زیادہ مضر تھی۔اس کی غذا حنظل سے زیادہ کڑوی، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرررساں، اس کا آسمان غموں کی بارش کرنے والا، اس کا بادل رنج وغم برسانے والا، اس کی زمین آبلہ دار، اس کے سنگریزے بدن کی پھنسیاں اور اس کی ہوا ذلت وخواری کی وجہ سے ٹیڑھی چلنے والی تھی۔ ہر کوٹھری پر چھپر تھا جس میں رنج ومرض بھرا ہوا تھا۔میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں۔ہوا بدبودار اور بیماریوں کا مخزن تھی۔مرض سستا اور دوا گراں، بیماریاں بے شمار، خارش وقوباء (وہ مرض جس سے بدن کی کھال پھٹنے اور چھلنے لگتی ہے) عام تھی۔ بیمار کے علاج، تندرست کے بقائے صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہ تھی۔ معالج، مرض میں اضافہ کرنے والا، معالج، ہلاک کرنے والا۔ طبیب، تکلیف ورنج بڑھانے والا تھا۔رنجیدہ ومریض کی نہ غم خواری ہی کی جاتی نہ اس پر رنج و افسوس کا ہی اظہار ہوتا۔

دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی المناک مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جاسکتی۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے۔ بخار موت کا پیغام، مرض سرسام اور برسام (دماغ کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علت تام ہے۔ بہت مرض ایسے ہیں جن کا کتب طب میں نام ونشان نہیں۔نصرانی ماہر طبیب، مریضوں کی آنتوں کو تنور کی طرح جلاتا اور مریض کی حفاظت نہ کرتے ہوئے آگ کا قبہ اس کے اوپر بناتا ہے۔مرض نہ پہچانتے ہوئے دوا پلا کر موت کے منھ کے قریب پہونچا دیتا ہے۔ جب کوئی ان میں سے مرجاتا ہے تو نجس وناپاک خاک روب جو درحقیقت شیطانِ خناس، دیو ہوتا ہے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا غسل وکفن کے بغیر اس کے کپڑے اتار کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے۔نہ اس کی قبر کھودی جاتی ہے نہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔

یہ کیسی عبرتناک والم انگیز کہانی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر میت کے ساتھ یہ برتاؤ نہ ہوتا تو اس جزیرہ میں مرجانا سب سے بڑی آرزو ہوتی۔ اور اچانک موت سب زیادہ تسلی بخش تھی۔ اور اگر مسلمان کی خودکشی مذہب میں ممنوع اور قیامت کے دن عذاب وعقاب کا باعث نہ ہوتی تو کوئی بھی

یہاں مقید و مجبور بنا کر تکلیف مالا یطاق نہ دیا جا سکتا۔ اور مصیبت سے نجات پالینا بڑا آسان ہوتا۔

یہ نا قابل برداشت حالات تھے ہی کہ میں متعدد سخت امراض میں مبتلا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے میرا صبر مغلوب، میرا سینہ تنگ، میرا چاند دھندلا، اور میری عزت ذلت سے بدل گئی۔ میں نہیں جانتا کہ اس دشوار و سخت رنج و غم سے کیوں کر چھٹکارا ہو سکے گا۔ خارش و قوباء میں ابتلا اس پر مستزاد ہے۔ صبح و شام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے۔ روح کو تحلیل کر دینے والے درد و تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب یہ پھنسیاں مجھے ہلاکت کے قریب پہنچادیں۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب عیش و مسرت، راحت و عافیت میں زندگی بسر ہوتی تھی۔ اب محبوس و قریب ہلاکت ہوں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب محسودِ خلائق غنی اور صحیح و سالم تھا۔ اب اپاہج اور زخمی ہوں۔ بڑی سخت مصیبتیں اور بیسیوں صعوبتیں جھیلنا پڑ رہی ہیں۔

ٹوٹی ہوئی ہڈی جس طرح لکڑی اور پٹی کا بوجھ اٹھاتی ہے اسی طرح ہم بھی نا قابل برداشت مصیبتیں اٹھا رہے ہیں۔

ان تمام مصائب کے باوجود اللہ کے فضل و احسان کا شکر گذار ہوں۔ کیوں کہ اپنی آنکھوں سے دوسرے قیدیوں کو بیمار ہوتے ہوئے بھی، بیڑیاں پہنے ہوئے زنجیروں میں کھینچے جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ انھیں لوہے کی بیڑیوں اور زنجیروں میں ایک سخت، تیز اور غلیظ انسان کھینچتا ہے۔ محنت و مہنت، کینہ و عدوات کا پورا مظاہرہ کرتا ہے۔ تکلیفوں پر تکلیفیں پہنچاتا اور بھوکے پیاسے پر بھی رحم نہیں کھاتا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس نے ان آفات و تکالیف سے محفوظ رکھا۔ میرے دشمن میری ایذا رسانی میں کوشاں اور میری ہلاکت کے درپے رہتے ہیں۔ میرے دوست میرے مرض کے مداوا سے لاچار ہیں۔ دشمنوں کے دل میں میری طرف سے بغض و کینہ مذہبی عقائد کی طرح راسخ ہو گیا ہے۔ ان کے پلید سینے کینہ و عداوت کے دفینے بن گئے ہیں۔

ان ظاہر اسباب پر نظر کرتے ہوئے میں اپنی رہائی سے مایوس اور اپنی امیدوں کو منقطع پاتا ہوں۔ لیکن اپنے رب عزیز و رحیم، رؤف و کریم کی رحمت سے نا امید نہیں ہوں۔ وہی تو جابر فرعونوں سے عاجز ضعیفوں کو نجات دلاتا ہے۔ اور وہی تو زخمی مظلومین کے زخموں کو اپنے رحم و کرم

کے مرہم سے بھرتا ہے۔ وہ ہر سرکش کے لئے جبار و قہار ہے۔ ہر ٹوٹے ہوئے دل کا جوڑنے والا، ہر نقصان رسیدہ فقیر کو کامیاب بنانے والا اور ہر دشوار کو آسان کرنے والا ہے۔

اسی نے نوح (علیہ السلام) کو غرق اور ابراہیم (علیہ السلام) کو طپش و حرق، ایوب (علیہ السلام) کو مرض و مصائب، یونس (علیہ السلام) کو شکم ماہی، اور بنی اسرائیل کو بربادی و تباہی سے نجات دی۔ اسی نے موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کو ہامان و فرعون، قارون اور عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کو مکرِ ماکرین، اور اپنے حبیب مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دجل و فریبِ کفار پر غالب کیا۔ پھر اگر مجھے مشقتوں، صعوبتوں اور حوادث و معاصی نے گھیر لیا ہے تو اس کی رحمت و فضل سے کیوں مایوس ہوں۔؟

وہی میرا رب، شافی و کافی اور خطاپوش و آمرزگار ہے۔ بہت سے بیمار جو موت کے کنارے پر پہنچ کر بھی اسے یاد کرتے ہیں شفا پاتے ہیں۔ بہت خطاکار جب استعذار و استغفار کرتے ہیں، مقبول بارگاہ ہوتے ہیں۔ بہت دردمند جب اسے پکارتے ہیں، مصیبت سے نجات پاتے ہیں۔ بہت مسافر جب اپنی حاجتیں پیش کرتے ہیں، مراد کو پہنچتے ہیں۔ بہت قیدی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں، خلاقِ مطلق انھیں بیڑیوں اور قیدوں سے بلا فدیہ و احسان چھٹکارا دلاتا ہے۔

میں بھی مظلوم و دل شکستہ و مضطر اور مسکین و ذلیل و محتاج بن کر اسی خدائے برتر کو پکارتا ہوں۔ اس کے حبیب کو وسیلہ بنا کر اور امیدوارِ رحمت ہو کر اس کی بارگاہ میں بصد تضرع التجا کرتا ہوں۔

وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اس نے مظلوم و مضطر کے یاد کرنے پر اجابتِ دعوت اور کشفِ مصیبت کا وعدہ کیا ہے۔ وہی مجھے تکلیف سے نجات دے گا۔ وہی قلق و اضطراب سے آزاد کرے گا۔ وہی امراض سے شفا بخشے گا۔ وہی پکڑنے والے سے چھڑائے گا۔ وہی ظالم سے بچائے گا۔ وہی میرے گریہ و بکا پر رحم کرے گا۔ وہی میری بدبختی و شامت کو مٹائے گا۔

وہ دعا کا سننے والا، بہت دینے والا اور بلاؤں کا دفع کرنے والا ہے۔ اسی سے جلا وطنی کے غم کو دور اور بہترین نعمتوں کے عطا کرنے کی امیدیں وابستہ ہیں۔

اے میرے رب! مصیبتوں سے مجھے نجات دے۔ اے امیدواروں کی امید گاہ اور اے التجا کرنے والوں کے پناہ گاہ! اپنے حبیب امین، اس کی آل طاہرین و مبارکین اور اس کے صحابہ محافظینِ دین کے صدقے میں ہماری سُن لے۔ اے ارحم الراحمین اور احکم الحاکمین! تو ہی

ظالموں سے مظلوموں کا انتقام لینے والا ہے۔ بیشک ساری تعریفیں، سارے جہاں کے پالنے والے کے لئے ہیں۔

یہ پُر درد والم انگیز کہانی ختم ہوئی۔ میں نے اپنی مصیبت و پریشانی کا کچھ حال دو قصیدوں میں بھی لکھا ہے۔ ایک قصیدہ ہمزیہ ہے جس میں شیطانی وساوس کا ذکر ہے۔ اور دوسرا دالیہ ہے جس میں اس غمگین ومعذور کی تکلیف ورنج کا تذکرہ ہے۔ ان دونوں قصیدوں کو سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مدح پر ختم کیا ہے۔

ان دونوں میں سے پہلے 'نون' کے قوافی میں بھی قصیدہ لکھا تھا جو دریتیم کی طرح فرید و یگانہ ہے۔ اس کا ہر شعر مضبوط و مرتفع قصر کی طرح ہے۔ اس کے تین سو سے کچھ زیادہ اشعار ہو کر رہ گئے۔ اس کے اِتمام کی نوبت نہیں آئی۔ مصائب وآلام کے ہجوم نے تکمیل کا موقع نہیں دیا۔ اس کا مطلع یہ ہے:

ما ناح اورق فی اوراق اشجان　　اِلا وھیج اشجانی و آشجانی

اگر اللہ نے مجھ پر رہائی سے احسان فرمایا تو اس ذات کی مدح اس میں شامل کر کے ختم کردوں گا جسے مکارمِ اخلاق سے پورا پورا حصہ ملا ہے۔ اس پر اور اس کی آل پر قیامت تک صلوٰۃ و سلام۔ و اللہ سبحانہ ولی التوفیق و الاکرام۔

☆☆☆☆☆

قارئین کرام: علامہ فضل حق خیرآبادی کا قصیدۂ ھمزیہ و قصیدہ دالیہ مع اردو ترجمہ ص ۸۶ تا ۱۱۹ باغی ہندوستان مؤلفہ عبدالشاہد شیروانی مطبوعہ المجمع الاسلامی مبارک پور ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء میں ملاحظہ فرمائیں۔

دار القلم دہلی

بفضلہ تعالیٰ دار القلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵ (رجسٹرڈ) کے قیام سے ملک وبیرون ملک کے اکثر علما و طلبہ اور دینی و علمی مطالعہ کا شوق رکھنے والے سنی خواص و عوام بخوبی واقف ہیں۔ (۱) قادری مسجد (۲) لائبریری (۳) اسلامک ریسرچ اکیڈمی (۴) دار التصنیف و التالیف (۵) دار الترجمہ (۶) ٹریننگ سینٹر (۷) دار الاشاعت (۸) میگزین (۹) سیمینار ہال (۱۰) مطالعۂ مذاہب (۱۱) دعوت و اصلاح (۱۲) رابطۂ علمائے ہند (۱۳) عالمی رابطہ (۱۴) مہمان خانہ جیسے اہم شعبوں پر مشتمل دار القلم مستقبل قریب میں اہل سنت کے عظیم تحقیقی و تصنیفی مرکز اور تاریخ ساز ادارہ کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت بھی حاصل کرے گا۔ ان شاء اللہ

مطبوعات دار القلم دہلی

(۱) قرآن اور جہاد	20/=	(۲) تعارفِ اہل سنت	15/=
(۳) تین برگزیدہ شخصیتیں	60/=	(۴) مسائل توسل وزیارت	30/=
(۵) امام احمد رضا! ارباب علم و دانش کی نظر میں	60/=	(۶) خصائص رسول	40/=
(۷) پیغام حجاز	15/=	(۸) تین طلاق کا شرعی حکم	20/=
(۹) موئے مبارک	22/=	(۱۰) سوادِ اعظم	20/=
(۱۱) جشنِ میلاد النبی	20/=	(۱۲) خاک حجاز	20/=
(۱۳) امام احمد رضا اور جدید افکار و تحریکات	90/=	(۱۴) انگریز نوازی کی حقیقت	60/=
(۱۵) آیاتِ جہاد کا قرآنی مفہوم	15/=	(۱۶) امام احمد رضا اور رد بدعات و منکرات	135/=
(۱۷) چند علمائے انقلاب (۱۸۵۷ء)	60/=	(۱۸) قائدِ جنگِ آزادی علامہ فضل حق خیر آبادی	60/=

تاجرانِ کتب خصوصی رعایت کے ساتھ مندرجہ بالا کتب حاصل کریں۔ عام قارئین بذریعۂ منی آرڈر مطلوبہ کتب کی پچیس فی صد رقم پیشگی ارسال کر کے وی پی سے کتابیں منگائیں۔ اس طرح آپ کے پاس مطبوعاتِ دار القلم کا ذخیرہ بھی جمع ہوتا جائے گا اور دار القلم کی خدمت بھی ہوتی رہے گی۔

جملہ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

دار القلم۔ قادری مسجد روڈ، ذاکر نگر، (جوگا بائی ایکسٹینشن)

نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

فون: 011-26986872، فیکس نمبر: 011-26987184